ISSN 0974-7346

ستمبر ۲۰۲۲ء

جلد ۲۰۹—عدد ۹

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰؍روپے۔ فی شمارہ ۳۰؍روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴؍روپے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰؍روپے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰؍روپے ہے۔

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔

اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۹ | ماہ صفر المظفر ۱۴۴۴ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۲۲ء | عدد ۹

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

زمانہ کی ایک خاصیت اس کا تغیر پذیر ہونا ہے۔ وقت کبھی اور کسی کا یکساں نہیں رہتا۔ وقت کا قلم ابتدائے آفرینش ہی سے عروج و زوال اور بننے اور بگڑنے اور سمٹنے بکھرنے کی کہانیاں لکھتا رہا ہے۔ اس لیے آج وقت جس شکل میں ہے وہ خواہ کیسا ہی بدصورت اور خوفناک نظر آئے، اس کے اثر سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کے مسائل اپنی جگہ ہیں لیکن وطن عزیز میں گزشتہ دس پندرہ برسوں سے نفرت، ناانصافی، حق تلفی، دیدہ دلیری، بے غیرتی، بے حسی اور حقائق سے چشم پوشی کے جراثیم نے جس طرح فضاؤں کو مکدر اور آلودگی سے جان لیوا بنادیا ہے۔ اس کا تدارک یا مداوا بھی جیسے معدوم ہوتا جاتا ہے۔ ہر طرف ماحول کچھ اس طرح نظر آتا ہے کہ حکومت اور اقتدار کے لیے صرف ضد اور ہٹ اور زیردستوں کے لیے سب و شتم، طعن و طنز ہی کافی ہے۔ ظلم اور ناانصافی کی جانب نگاہ نہ کی جائے اس کے لیے پرفریب نعروں اور مکر و کید سے بھرے جملوں کی ایسی دھند پھیلادی جائے، جو دل و دماغ اور سماعت و بصارت کو روشنی کی ہلکی سی کرن سے بھی محروم کردے۔

***

اگست کا مہینہ برصغیر کے لیے غیروں کی بالادستی اور محکومی کی زنجیروں سے رہائی کی یاد دلاتا ہے لیکن اس سال اسی مہینے میں قومی اور قانونی اخلاق و کردار کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا گیا اور وحشیانہ تکبر اور اقتدار کی تباہ کن ہوس کا جس طرح مظاہرہ کیا گیا، اس پر غیر جانب دار غیر ملکی طبقوں کے ساتھ خود ملک عزیز کا ضمیر بھی بے چین ہو اٹھا، گجرات کی بلقیس بانو کے ساتھ ہندو مسلم فسادات کے نام پر جو ہوا تھا وہ ہمیشہ کے لیے انسانی تاریخ کے سیاہ صفحات کا حصہ بن گیا، بلقیس بانو کے ساتھ جو ہوا اس کے لیے جرم، گناہ اور ظلم جیسے الفاظ بھی اپنی معنویت کی بے مائیگی کا شکوہ کر سکتے ہیں، ایسے سنگین اور نہایت درجہ قابل نفریں جرم کے مرتکب انسان نما حیوانوں کو رہا کیا جانا اور پھر جیل سے باہر آنے پر ان کے لیے خوش آمدید کہنے کے عمل کو کن لفظوں سے تعبیر کیا جائے۔ زبان اور بیان دونوں اس سے قاصر، اخلاقی، ذہنی، فکری دیوالیہ پن کی اس سے بڑی مثال اگر کہیں مل سکتی ہے تو وہ صرف انسانی تاریخ کے معدودے چند جابروں اور سرکشوں اور انسانیت کے لیے باعث ننگ و عار بدنصیبوں کی زندگی ہی میں نظر آسکتی ہے۔

***

ایسا پہلے بھی ہوا ہے کہ عاقبت نااندیش حکمرانوں اور ان کی بے قابو رعایا نے ملکوں اور قوموں کے

دلوں کو امن واطمینان سے محروم کردیا، ملک کے انتشار اور پراگندگی نے ان کے جنون اور بے عقلی کو اور ہوا دے دی، مجرم پہلے بھی چھوڑے جاتے رہے، باغی، درباروں میں جگہ پاتے رہے، غدار انعام کے حقدار بنتے رہے، دنیا میں اس طرح کی شکلیں بن بن کر بگڑتی رہیں، لیکن انجام کار کیا ہوا؟ بادی النظر میں جن کو نعمت سمجھا گیا وہ آزمایش کے بعد صرف دھوکا ہی ثابت ہوئیں۔

***

اعمال کا حساب توان کے انجام ہی سے ہوتا رہا ہے۔ موجودہ وقت بھی اس جماعت سے یہی گزارش وفرمایش کررہا ہے جو جبر واستبداد کا سب سے بڑا اور مستقل نشانہ ہے۔ اگست کا یہ مہینہ قمری یا اسلامی تقویم کے پہلے مہینے کی زمانی قربت والا بن گیا، محرم اسلامی سال کا صرف پہلا مہینہ ہی نہیں ،انسانی جدول وتقویم کی تاریخ میں زمانہ اور عصر کی اس حقیقت کا پہلا ترجمان اور شاہد بھی ہے کہ وقت کو موسموں اور انسانوں کی پیدائش و وفات کے حوالوں سے جاننے سے زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ انسانی تاریخ میں جبر و تشدد اور انسانی جان ومال وعزت کی حرمت کی پامالی کے خلاف جہاد واحتجاج کی سب سے بہتر عملی مثال کو وقت کی ہر سالانہ کروٹ پر یاد رکھا جائے۔ انسانیت کی محسن اور انسانی خوبیوں کی کامل ترین شخصیت نے اقتدار ، دولت ، عہدہ و منصب، قومیت اور اکثریت کی قوت اور وطن اور اس کی مٹی کی جاذبیت، رشتوں اور قرابتوں کی بنیاد پر حاصل ہونے والی اضافی طاقت سب کو محض اس لیے خیر باد کہہ دیا کہ وہ انسانی عزت و وقار اور انسان کی تخلیق کے منافی اقدار بلکہ شیطانی اوہام وتصورات کی نمائندہ ہیں، اس لیے ان سے دوری اور بے زاری کا وہ عمل زندہ کیا جائے، جس کی ایک جھلک ہزاروں سال پہلے اسی محسن انسانیت کے جدامجد نے یہ کہہ کر پیش کی تھی کہ انّی مہاجر الی ربی (میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں) یہ محض ایک شخص کا ذاتی تجربہ یا ذہنی رجحان نہیں تھا، یہ پوری نسل انسانی کے لیے ایک منشور اور قاعدہ کلیہ بھی تھا کہ وہ زمانوں اور حالات اور مسائل ومشکلات کے جبر اور اس کے دائرہ کی اسیر و محصور نہیں رہ سکتی۔مہاجرالی ربی میں یہ نکتہ بھی پنہاں تھا کہ ہجرت قید مقام کی پابند نہیں، زمین پر انسانی ہاتھوں کی طرح لکیریں بنانے سے انسانوں کی قسمت کا فیصلہ نہیں ہوسکتا کہ زمین کے ایک ٹکڑے سے نکل کر دوسرے میں بس جانے سے ہجرت کے معنوں کی تکمیل ہوجائے گی۔ ظلم وجبر کا شکار بننے والوں کی ہجرت وہ ذہنی ہجرت ہے جو غیر انسانی رویوں سے آنکھیں ملاسکے، ہجرت نبوی میں یہ پیغام صاف اور نمایاں ہے کہ ایمان ویقین کی صلابت ہی

وہ کار گر ذریعہ ہے جو انسان کو غموں سے بے نیاز کر کے اس کائنات کے خالق و مالک کی ہمر ہی کی بشارت اور اس کی مدد ضمانت دیتا ہے۔ جب فرد اور قوم کو مصائب کا سامنا کرنے کی ہمت اور ہر غیر انسانی بلکہ شیطانی قوت کے سامنے ثابت قدم رکھنے والی استقامت کی جانب رخ کرنے کی توفیق ملے تو یہ ہجرت کی تفہیم کی کامیابی ہی ہو گی، اصولوں، منصوبوں، کام کے طریقوں، حالات کے تجزیہ کی غلطیوں سے نکل کر صحیح فیصلوں کی جانب رخ کرنے کو ہجرت کے عمل کا ایک حصہ سمجھنے میں کیا حرج ہے؟ کہ اس کے نتیجے میں بھی سکون و سکینت کی نعمت اور ناشکروں کے مقابلے میں اللہ کے شکر گزاروں کی بات کی سربلندی کی عزت مل کر رہتی ہے۔ ہاں ہجرت کے رموز کو فاش کرنے سے پہلے مجبوروں اور مقہوروں سے یہ سوال ہمیشہ غور اور توجہ کے قابل رہے گا کہ ایمان والے ہو تو پھر بداعمالیوں کی دنیا سے نکلنے پر ہچکچاہٹ کیوں؟ کہیں آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی بھا تو نہیں گئی، جب کہ اس دنیا کی زندگی کا سامان آخرت کی اصل زندگی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا ارضیتم بالحیوۃ الدنیا من الآخرۃ فما متاع الحیوۃ الدنیا فی الآخرۃ الا قلیل (کیا تم دنیا کی زندگی پر بمقابلہ آخرت کے راضی ہو گئے؟ دنیا کی زندگی کا سامان آخرت کے مقابلے میں بہت قلیل ہے)۔ ہجری سال کے آغاز اور جبر و قہر کے سلسلہ دراز کے درمیان ان سچائیوں کی تلاش ہی اصل مرض کا مداوا ہے۔

***

یہ خبر ایک عالم کو افسردہ کر گئی کہ جواں سال مصنف تذکرہ نگار اور صاحب تصانیف کثیرہ مولانا محمود حسن حسنی ندوی اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ لیاقت، صلاحیت، شرافت اور مروت کی خوبیاں کس طرح ایک وجود کو مثالی بنا دیتی ہیں، مرحوم اس کا بہترین نمونہ تھے۔ ان کے قلم سے مولانا زبیر الحسن کاندھلوی، شاہ ابرار الحق صاحب، مولانا سید محمد ثانی حسنی، مولانا محمد یونس جونپوری، مولانا حسین احمد مدنی، شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ نامور شخصیات پر کتابیں نکلیں، ان میں اکثر کا تذکرہ معارف میں آیا۔ ان کی وفات ندوہ اور خانوادہ حسنی ہی کا نقصان نہیں، علم اور عرفان کے خدا جانے کتنے جام و پیمانہ ان کو یاد کر کے مدتوں رویا کریں گے۔ اللھم اغفر وارحم۔

***

مقالات

انقلابِ نبوی: حقائق، طریقہ کار اور امتیازات

مولانا محمد عاصم کمال الاعظمی

استاد مدرسہ بیت العلوم سرائے میر، اعظم گڑھ

abuamrakamal@gmail.com

اللہ ربّ العزت کے آخری پیغمبر، حضرت محمد بن عبد اللہ (ﷺ) کی بعثت اس حال میں ہوئی جب انسانیت گراہ رہی تھی اور پستی و زوال کے آخری نقطہ پر پہنچ چکی تھی۔ وہ تاریخ انسانی کا تاریک ترین اور پست ترین دور تھا جب لوگ خدا فراموش ہو کر خود فراموش ہو چکے تھے، بھلے برے کی تمیز سے محروم ہو چکے تھے، پیغمبران ورسل کی دعوت عرصہ ہوا دب دبا گئی تھی۔ جن دلوں میں اس کے کچھ اثرات تھے وہ دنیا اور اہل دنیا سے لاتعلق ہو کر کنارہ کش ہو گئے تھے۔ روم وایران اس وقت مغرب و مشرق کی قیادت و زعامت کے اجارہ دار بن بیٹھے تھے۔ حیوانیت انسانیت کی پہلی شناخت بن چکی تھی۔ تمام اقدار وروایات کا جنازہ نکل چکا تھا۔ شرح خواندگی معدوم تھی، خوں ریزیاں اور جنگ ومعرکے عادت بن چکے تھے۔ معاشرہ تہذیب وثقافت سے نابلد ہو چکا تھا۔ خانگی اور عائلی نظام ابتر ہو گیا تھا۔ اخلاقیات کی بنیادیں ٹوٹ چکی تھیں۔ ہر طرف دعوی انانیت اور ہر سمت بے مروتی عام تھی۔ لوگ آسمانی نظام اور قدرت کے اصولوں سے یکسر غافل ولا علم تھے۔ تہذیب وتمدن کے ٹھیکیدار ظلم وعناد کے علم بردار تھے۔ طاقت ور اور کمزور کا نمایاں فرق تھا۔ مالی واقتصادی نظام میں حد درجہ افراط وتفریط تھی۔ امیر دولت وسرمدی کے ثریا تک پہنچا ہوا تھا، اور غریب احتیاج وافلاس اور درماندگی کی خاک میں پیوست تھا۔ دولت وحکومت پر چند گھرانوں اور قوموں کی اجارہ داری تھی بلکہ سیاست واقتدار، ظلم وستم اور بالادستی کا ایک چلتا پھرتا عنوان تھا۔ انسانیت کا بھید بھاؤ اوران میں امتیاز وتفاوت طرہ امتیاز بن چکا تھا۔ اہل دنیا کے پاس نہ کوئی مستند ومعتبر آسمانی ہدایت باقی تھی اور نہ دنیا کے لیے کوئی اصول وانتظام۔ ہر سمت ظلمت وضلالت کا پہرہ تھا۔

اس صورت حال میں خدا نے انسانوں پر ترس کھا کر دین محمدی سے دنیا کو سرفراز کیا؛ البتہ چوں کہ اسلام اپنی آمد کے لحاظ سے ایک کھلا ہوا چیلنج تھا، اور مکہ مکرمہ کی صورت حال کے تناظر میں ایک عجیب عقدہ تھا کیوں کہ ایک جانب کعبۃ اللہ کا تقدس اور ارضِ حرم کی عظمت واحترام اور اس سے وابستہ اہل عرب اور دیگر اقوام وملل کا عقیدہ وعقیدت تو دوسری جانب احوال عالم کا فساد، خصوصاً اہل عرب کی تباہ حال معاشرت ومعیشت، تدین وتمدن۔ لہٰذا ایک انقلابی وپر حوصلہ تحریک کی قیادت کے ساتھ ایسی عزیمت درکار تھی جو اولاً اپنے صبر واستقامت اور جفاکشی کے ذریعے ہر طوفان کا رخ موڑ دے، اٹھنے والی آواز کو پست ہونے پر مجبور کر دے، ہر مخالف حربے کا توڑ ثابت ہو، ہر منفی فکر کو مثبت رخ عطا کر سکے۔ آخری مراحل میں ایسی حکمت وہوش مندی، تدبیر وتدبر مطلوب تھا، جو تنگی میں راستہ دکھائے، ظلمت میں چراغ راہ ثابت ہو، پریشاں حالی کے لیے وجہ سکون ہو، جس میں ہر طاقت کو خاک میں ملانے کا منصوبہ ہو، ہر مظلوم کی دادرسی کر سکے، اور پھر ایسا نظام پیش کرے جو از روئے عقل ودانش بھی تمام عالم کے لیے تا صبح قیامت مشکاۃ ومشعل راہ اور نمونہ عمل بن کر روشن ہو، جس کی روشنی ورہنمائی میں انسانیت اپنے تعمیری وتربیتی تمام امور بحسن وخوبی وبوجہ اتم سرانجام دے سکے۔ مزید اس کے ساتھ تائیدات غیبیہ اور برکات سماویہ کی بھی آمیزش ہو.... ذیل کے چند صفحات میں اعلیٰ نوعیت کے ایک انقلاب اور اس کے منہج وطریقہ ہائے کار پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کا تعلق نبی رحمت حضرت محمد ﷺ کی ہستی سے براہ راست ہے، اور جس کی اساس آپ کی حیات بابرکات اور مساعی جمیلہ ہے، جن میں آفاقیت وعالم گیریت اور مراعات فطرت وآدمیت بھی ہے۔ لہٰذا حضرت محمد ﷺ کی مختصر زندگی میں اس عظیم اور تاریخی انقلاب کے از ابتدا تا انتہا جملہ مراحل طے ہو جانے کے حوالے سے غور کرنے کی ضرورت ہے، کہ آپؐ کی اس عظیم انقلابی جدوجہد کی تہ میں کارفرما وہ اصل طریقہ کار اور اساسی منہج کیا تھا، آپ کے مقصد بعثت اور طریقہ انقلاب کی نوعیت کیا تھی، جس کے ذریعے وہ مردانِ کار فراہم ہوئے جنھوں نے "انقلاب نبوی ﷺ" کے شجرہ طیبہ کو اپنے خون سے اور اپنی فکری، علمی، عملی اور بلند صفات سے پروان چڑھایا؟

اس مسئلہ کی مکمل وضاحت کے لیے جب قرآن کریم کی طرف توجہ کی جائے تو آپ کے مقصدِ نبوت کے حوالے سے قرآنی بیان کچھ اس طرح ہے: وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انھیں میں سے (محمدؐ کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور (اللہ کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔ (جمعہ:۲)

اس آیت کریمہ میں باری تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کے مقصد بعثت کو بیان کیا ہے؛ جن میں

چار چیزیں اصل ہیں: ۱۔ تلاوت آیات ۲۔ تزکیہ نفوس ۳۔ تعلیم کتاب ۴۔ اور تعلیم حکمت
البتہ آپ کے اس مقصد بعثت کے انقلابی پہلو کو بیان کرنے کے لیے دوسرا انداز اختیار فرمایا، اور اپنی کتاب مبین میں تین جگہ اس کا ذکر فرمایا: ''وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر ﷺ کو ہدایت (کی کتاب) اور دینِ حق دے کر بھیجا تا کہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے اور حق ظاہر کرنے کے لئے اللہ ہی کافی ہے'' (فتح: ۲۸، توبہ: ۳۳، صف: ۹)۔

ان دونوں آیات کے تناظر و تطابق کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کا مقصد بعثت دین حق کا تمام ادیان و مذاہب پر تفوق و غلبہ ہے جس کے لیے منہج عمل اور طریقہ کار مذکورہ بالا چاروں امور ہیں۔

مکی دور میں نبوی انقلاب کا مختصر جائزہ

نظریہ انقلاب، کسی بھی تحریک یا انقلاب کے لیے پہلی اور بنیادی چیز ہے۔ ''نظریہ'' اور ''فکر'' جو عام حالات کے مخالف ہو، ایسا جامع و ہمہ گیر ہو جو ہر طبقہ انسانی کو متوجہ ہونے پر مجبور کر دے، اس پر غور کرنے کا سبب ہو، سماجی، مذہبی، انتظامی اور ذاتی سطح پر ہر کس و ناکس کو دعوت فکر و عمل دے، کوئی شخص خود کو اس مدعیٰ سے مستثنیٰ و خارج نہ سمجھے۔ چنانچہ نبی پاک ﷺ جس ماحول میں تشریف لائے وہ خدا سے دوری کا دور تھا۔ عرب زیادہ تربت پرست تھے۔ خدا سے تعلق کے رابطے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ان کے یہاں خدا کا انکار کم تھا، لیکن غیر کا اقرار و پرستش زیادہ تھی۔ ان کا نظریہ جیسا کہ قرآن نے بیان کیا یہ تھا: ''اور جن لوگوں نے اس کے سوا اور دوست بنائے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم ان کو اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو اللہ کا مقرب بنا دیں''۔ (زمر: ۳)۔ ان کی بت پرستی اس قدر غالب اور طبیعتوں میں راسخ ہو گئی تھی کہ خود کعبۃ اللہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے[۱]۔ اس تناظر میں آپ تشریف لائے تو انبیاء سابقین کی طرح آپ کو بھی بنیادی طور پر تین چیزوں کی دعوت و تبلیغ کا مکلف کیا گیا: توحید، رسالت اور آخرت (جو تمام مذاہب سماویہ کے اصل الاصول ہیں)؛ جیسا کہ وارد ہے:

۱۔ مسلم بن الحجاج: صحیح مسلم: کتاب الجہاد والسیر، باب ازالۃ الاصنام من حول الکعبۃ، مکتبہ دار السلام ط: ۲، ریاض ۱۴۲۹ھ، ص: ۹۹۵۔

اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور بتوں (کی پرستش) سے اجتناب کرو (نحل:۳۶)؛ جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے اُن کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو (انبیاء:۲۵)

آپ ابتدائی سالوں میں انفرادی دعوت دیتے رہے، پھر باری تعالیٰ کا ارشاد ہوا: ''اے (محمدؐ) جو کپڑے لپیٹے پڑے ہو، اٹھو اور ہدایت کرو، اور اپنے پروردگار کی بڑائی کرو، اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو، اور ناپاکی سے دُور رہو'' (مدثر:۱،۶)۔ چنانچہ آپ کو مکلف بنایا گیا کہ نافرمانوں کو ان کی خطرناک حالت سے آگاہ کریں، اور انجام سے ڈرائیں، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور کبریائی و عظمت و جلال کو آشکار کریں، لوگوں کو اعتقاد، اعمال اور اخلاق کی ظاہری و باطنی نجاست سے پاک رہنے کی تعلیم دیں، صفائی اور پاکدامنی سکھائیں۔ اس کے بعد ارشاد ہوا: ''اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈراؤ'' (شعراء:۲۱۴) تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اقرباء و بنی ہاشم کو دعوت توحید دی، پھر ''کوہ صفا'' پر علی الاعلان اپنے اس نظریہ انقلاب کا اعلان فرما کر یہ نعرہ بلند دیا: ''قولوا لاالٰہ الا اللہ تفلحوا''۔

توحید ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نظریۂ انقلاب تھا، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حسب موقع و حسب حال لوگوں کے سامنے ظاہر کیا، اور خدا کی جانب سے اس دعوت انقلاب اور نعرہ انقلاب ''فاعلم انہ لاالٰہ الا اللہ'' (محمد:۱۹) کے بعد آپؐ نے اپنی مکمل صلاحیت، مکمل وقت اور سارا مال لگا دیا۔ چنانچہ ربیعہ ابن عباد دیلمی کی روایت میں ہے کہ: انہ رأی النبی ﷺ بذی المجاز وھو یمشی بین ظہرانی الناس یقول: یاایہاالناس قولوا لاالٰہ الا اللہ تفلحوا۔[۲] (میں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ذی المجاز میں دیکھا۔ وہ لوگوں کے درمیان چل رہے تھے اور کہتے جاتے تھے: اے لوگو لاالٰہ الا اللہ کہو تم کو کامیابی ملے گی)۔

یہ نظریۂ توحید چند امور کو متضمن تھا؛ مثلاً اس نظریۂ توحید کا پہلا تقاضہ ہے کہ حاکمیت و حکومت صرف اللہ رب العزت کے لیے ہے، دنیا کی کوئی چیز مالک و مختار نہیں، صرف اسی کے فیصلے کا نفاذ ہوگا، کوئی انسان حاکم و سلطان نہیں، فقط اللہ جل شانہ ہی شارع و قانون ساز ہے۔ ان الحکم الا للہ: (سن لو کہ) اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے (یوسف:۴)۔

اس نظریۂ توحید میں دوسری چیز یہ شامل ہے کہ ہمارے پاس جتنی چیزیں ہیں ان کا مالک تن تنہا باری تعالیٰ ہے۔ ہر چیز اسی کی ہے، ہماری جان، ہمارا مال، و اولاد سب اسی کی عنایت ہے۔ ہم صرف استعمال کرنے

۲۔ شمس الدین محمد بن احمد الذھبی: سیر اعلام النبلاء، ۲۱۲/۱، دارالحدیث، قاہرہ مصر، ۱۴۲۷ھ/۲۰۰۶ء۔

والے ہیں، وہ ہمارے پاس امانت ہے، مالک صرف وہ ہے، اور نہ صرف ہم بلکہ دنیا کی ہر شئی اسی کی ملکیت کا حصہ ہے، حتی کہ زمین و آسمان بھی اسی کی ملک کا حصہ ہیں: ''جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان دونوں کے بیچ میں ہے اور جو کچھ (زمین کی) مٹی کے نیچے ہے سب اسی کا ہے'' (سورہ طٰہٰ:۶) اور اس شق کا تقاضہ یہ ٹھہرا کہ ہم آزاد و مختار نہیں کہ اپنے آس پاس کی چیزوں کو حسب منشاء استعمال کر سکیں، بلکہ ہم مجبور ہیں کہ ان کو حسب منشاء الٰہی استعمال میں لائیں، خود کو قدرت کی عنایت کردہ چیزوں کا امین سمجھیں۔ اسی طرح ہاتھ پاؤں ذہن و دماغ اور تمام صلاحیتوں کے استعمال کا اختیار انھیں چیزوں میں ہوگا جہاں قدرت کی مرضی ہو، اور اپنے مال کو وہیں خرچ کر سکیں گے جہاں رب کی اجازت ہوگی۔ حضرت شعیب کی دعوت کے مقابلے میں ان کی قوم نے یہی سوال کیا تھا: ''وان نفعل فی اموالنا مانشاء'' (سورہ ہود:۸۷) (اے شعیب! کیا تمہاری دعوت کے اعتبار سے ہمیں اتنا بھی اختیار نہیں کہ ہم مالوں میں من چاہا تصرف کر سکیں)۔

نعرۂ توحید کا ایک تیسرا تقاضہ ہے، جس کا تعلق سماجی سطح سے ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نعرہ دیا کہ: انسانی افراد کے درمیان امتیاز و تفاخر کی حسبی یا نسبی کوئی وجہ نہیں، ان میں فطری طور پر سب لوگ یکساں و مساوی ہیں، اور سب افرادِ معاشرہ کو بحیثیت فردِ انسانی مکمل معاشرت کا حق ہے۔ ازروئے پیدائش نہ کوئی کہتر ہے نہ مہتر۔ اور اسلامی انقلاب کے اس جزء کو بھی دیگر اجزاء کی مانند اغیار اسلام نے مانا ہے اور بنظر استحسان دیکھا ہے۔ اس نظریے کے تحت تمام افراد میں امتیاز صرف کمالات اور خوبیوں کے لحاظ سے ہوگا۔ آج کا معاشرہ شاہد ہے کہ معیار فضیلت و کرامت اسباب و وجوہ کمالات ہیں، نہ کہ فقط ولادت و پیدائش۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کے لیے وجہ کمال یہ متعین کیا ہے: ''اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے''۔ (الحجرات:۱۳)۔ البتہ چوں کہ موضوع انتہائی حساس اور نعرہ حالات کے بالکل مغائر تھا تو اس نعرۂ توحید کی گونج اسباب کے لحاظ سے اس دور کے ہر ممکن مقام تک پہنچ گئی اور آپ کی دعوت (قولوا لاالہ الا اللہ) کا نعرہ ہر جگہ بلند ہونے لگا۔ آپؐ نے اس نظریہ کی تبلیغ و تشہیر میں مکمل توانائی و قوت صرف کی اور اس کے لیے اس دور کے تمام ذرائع اور تعلقات و وسائل کا استعمال فرمایا۔ اس عظیم الشان انقلابی نعرہ کے مقابل، دشمنوں کا آپے سے باہر ہو جانا فطری بات تھی، جس کے نتیجے میں اس مسئلۂ توحید کے خلاف سارا قریش متحد ہو گیا، اور آپؐ کے خلاف ہر قسم کی ایذا رسانی کو روا رکھا۔ لیکن آپ کے لیے حکم تھا کہ ان سے اعراض کریں اور اس انقلابی نعرہ اور انقلابی دعوت کو خوب قوت سے پیش کریں: ''پس جو حکم تمہیں (اللہ کی طرف سے) ملا ہے وہ (لوگوں کو) سنا

دو اور مشرکوں کا (ذرا) خیال نہ کرو (الحجر: ۹۴)

افراد سازی و تنظیم جماعت

رفتہ رفتہ کاروان انقلاب مشقت اور اذیتوں کی وادی سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ ایک معتد بہ تعداد مشرف باسلام ہو چکی تھی۔ روز بہ روز اس میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ادھر کفار قریش میں ہلچل مچی تھی، وہ اس انقلابی نظریہ اور انقلابی کارواں کو روکنے کے لیے ہر ممکن تدبیر اور ہر مدافعتی حربہ اختیار کرنے میں لگے ہوئے تھے، اور جناب رسول اللہؐ دعوت توحید اور اس کے منطقی اور عقلی دلائل بیان کرنے کے ساتھ اپنے افراد پر مکمل توجہ فرمائے ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا مکمل نظم بنایا گیا تھا، اور اس کام کے لیے ایک خفیہ مقام ''دار ارقم'' کا انتخاب ہوا تھا، جہاں نو واردان اسلام جمع ہوتے، اور داعی انقلاب ان کی خبر گیری اور احوال پرسی کے ساتھ ان کی ہر قسم کی تعلیمی و تربیتی نوعیت پر محنت فرماتے، ان میں نظریۂ توحید کی چنگاری بھڑکاتے، اور اس انقلابی مہم کے لیے جسمانی و روحانی طور پر مکمل منشرح کرتے اور حسب وسعت اس نظریہ کی اشاعت پر زور دیتے۔ چنانچہ حضورؐ نے جن افراد کو تیار کیا اور جن کی تعلیم و تربیت فرمائی ان کا حال خود انھیں کی زبانی ملاحظہ فرمائیں اور اندازہ لگائیں کہ جس انقلاب کو ایسے میدان کار اور جاں نثار فراہم ہو جائیں تو اس انقلاب کی تکمیل و تعمیم اور آفاقیت و ہمہ گیریت کے لیے کیا چیز مانع بن سکتی ہے۔ صحابہ کی بیعت کے الفاظ ان کی عظمتوں کے عینی شاہد ہیں:

عن عبادة بن الوليدعن ابيه عن جده قال: بايعنا رسول الله ﷺ على السمع والطاعة فى العسر واليسر، والمنشط والمكره، وعلى اثرة علينا،وعلى ان لا ننازع الامر اهله،وعلى ان نقول بالحق اينما كنا، لا نخاف فى الله لومة لائم[۳] (عبادہ بن الولید نے اپنے والد سے اور انہوں نے ان کے دادا سے روایت کی: ہم نے رسول اللہ ﷺ سے مشکل اور آسانی، خوشی اور تکلیف اور خود پر ان کو ترجیح دینے کی بنیاد پر سمع و طاعت کی بیعت کی اور یہ کہ مسئلے کے لئے اہل شخص سے مسئلے کے بارے میں جھگڑا نہیں کریں گے، ہم جہاں بھی ہوں گے حق کی بات کہیں گے اور اللہ کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے)۔

یہ حقیقت ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے جس نوعیت کی شخصیت سازی اور تنظیم سازی فرمائی وہ بالیقین

۳۔ مسلم بن الحجاج: صحیح مسلم: کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء، مکتبہ دار السلام ط: ۲، ریاض ۱۴۲۹ھ ص: ۱۰۰۷۔

ایک بڑے انقلاب کی دلیل ہے۔ آپؐ نے جو جماعت تشکیل دی وہ انتہائی مضبوط جماعت تھی۔ آپؐ کے جاں نثاروں نے وصف اطاعت کا حق ادا کر دیا۔ خود کو سراپا سمعنا واطعنا کا مظہر بنا دیا۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے موقع پر جب آپؐ نے مختلف کبار صحابہ سے جنگ کے سلسلہ میں رائے لی تو حضرت سعدؓ نے منشاء نبوت کو بھانپ کر کہا کہ ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں اور آپؐ کی تصدیق کی ہے، تو کسی موقع پر آپؐ کو تنہا نہیں چھوڑیں گے، ہم سراپا تسلیم و رضا ہیں۔ اسی مذکورہ موقع پر حضرت سعد بن معاذؓ نے فرمایا:

فامض یارسول اللہ لماأردت، فنحن معک، فوالذی بعثک بالحق لواستعرضت بنا البحر فخضتہ لخضناہ معک، ماتخلف منارجل واحد[۴] (اے رسول اللہ آپ جو چاہتے ہیں کر گزریئے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم جس نے آپؐ کو بھیجا ہے اگر آپؐ سمندر کے سامنے آئیں اور اس میں کود پڑیں تو ہم بھی آپؐ کے ساتھ کود پڑیں گے۔ ہم میں سے کوئی پیچھے نہیں رہے گا)۔

ان زبانی اور تمام عملی شہادتوں کے نتیجے میں کہا جا سکتا ہے، کہ کسی انقلاب کے لیے اس سے بہتر تنظیم اور افراد سازی نہیں ہو سکتی، ان کی عظمتوں کے بیان سے قرآن کریم پُر ہے۔

مرحلہ صبر وجفاکشی

کسی انقلاب کے بانی کے لیے بنیادی طور جس چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اس کا نام ہے ''صبر وجفاکشی اور عدم انتقام''۔ صبر کے بغیر کوئی تحریک آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس انقلاب نبوی کے بانی اور افراد میں اس صفت کا پایا جانا بہت ضروری تھا، چنانچہ نبی رحمت نے جب نعرۂ توحید بلند کیا، اور لوگوں کو تمام خداؤں سے کاٹ کر خدائے واحد کی طرف بلایا تو انہوں نے ہر قسم سے آپ کے لیے تنگی کا سامان کیا، آپ کو مجنون وشاعر کہا گیا، کبھی جن اور سحر کے اثر سے مسحور بتایا گیا، کاذب ودھوکہ باز کہا گیا، یا مال کا لالچی کہا گیا یعنی وہ تمام حربے اختیار کیے گئے جن سے آپ کی کردار کشی ہو، قوت ارادی ٹوٹ جائے اور آپ کے حوصلے پست ہو جائیں اور آپ اپنے دعوی توحید سے باز آجائیں۔ آپ کے لئے اذیت کا سارا سامان کیا گیا اور مقصد و مدعا سے بھٹکانے کی تمام تدبیریں اختیار کی گئیں، آپ کو حد درجہ ستایا گیا، آپ پر تکالیف کے پہاڑ گرائے گئے۔

۴۔ ابوالفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر دمشقی: البدایۃ والنہایۃ، داراحیاء التراث العلمی، بیروت لبنان، ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء ۳/۲۰۸۔

ان احوال میں آپ کو حکم تھا: ''اور جو جو (دل آزار) باتیں یہ لوگ کہتے ہیں ان کو سہتے رہو اور اچھے طریق سے ان سے کنارہ کش رہو(المزمل:۱۰) ۔اُن کی باتوں پر صبر کیجیے،اور بھلے طریقے سے ان کو چھوڑ دیجیے۔ لہٰذا نہ صرف آپ نے صبر کا دامن تھامے رکھا،بلکہ حضرات صحابہ کو کسی قسم کے اشتعال وانتقام سے روکے رکھا،اوران کو صبر کی تلقین کی، مختلف قسم کی تکلیفوں پر جب صحابہ لرزاٹھتے تھے توان کے نبی کی طرف سے صرف صبر کی تلقین ہوتی تھی،ان کی اس صفت کا قرآن نے حوالہ دیا: ''بھلا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو (پہلے یہ) حکم دیا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو (جنگ سے) روکے رہو'' (نساء:۷۷)۔ظاہر ہے کہ اس ''کفوا ایدیکم'' والے نسخے پر عمل کا ایک سبب یہ تھا کہ مسلمان قلت میں تھے، انتقام و مسلح تصادم کی شکل تحریک اسلام کے لیے سازگار ثابت نہ ہوتی،اور پھر یہ انقلاب کے ابتدائی مراحل تھے، تصادم واشتعال آخری مرحلے کے لیے سزاوار ہے،جب حالات اور گردونواح کے حالات موافق ہوں، یا کم از کم مخالف نہ ہوں۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہؓ نے نہ صرف صبر سے کام لیا؛بلکہ صبر کی اعلیٰ مثال قائم فرمائی جو ایک عظیم انقلاب کے لیے مفید و معاون ثابت ہوئی۔

اِدھر دعوت توحید عروج پر تھی،اور اُدھر مسلمانوں کا صبر کام آرہا تھا۔اہل اسلام کے ساتھ لوگوں کی ہمدردیاں بڑھ رہی تھیں، جس کے لیے اسلام اور نبی اسلام کا گھیرا مزید تنگ کیا جانے لگا، حتیٰ کہ آپ کو اپنے صحابہ کے ساتھ وطن عزیز کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہنا پڑا،اور ایک نئے وطن کی جانب ہجرت و ترک وطن کرنا پڑا۔ لیکن یہ انقلابی تحریک سے واپسی یا فرار نہ تھا؛بلکہ اس کو نیا رخ دینے اور نئی سمت پر کام کرنے کی غرض سے تھا،اس لیے کہ ہجرت سے قبل ہی اس زمین کو ہموار کرلیا گیا تھا۔اس کی واضح مثال ان کا وہ شاندار استقبال واظہار محبت ہے، جو انھوں نے آمد رسول کے موقع پر پیش فرمایا،اور جس جذبۂ عقیدت سے آپ سے پیش آئے وہ ظاہر کررہا تھا کہ یہ خطہ ''مدینۃ الرسول'' بن کر ایک عظیم انقلاب کی قیادت کے لیے مکمل تیار ہے۔

ادھر اسلام مکہ سے باہر بھی پہنچ چکا تھا، مثلاً حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ جو ملک یمن کے ایک خطے کے فرماں روا تھے، مسلمان ہو کر اپنے قبیلے میں گئے اور وہاں اسلامی انقلاب کی بنیاد ڈالی اور پھر ہجرت مدینہ فرما کر ستر گھرانوں کو مسلمان بنا کر لائے، جن میں مشہور راوی حدیث حضرت ابوہریرہؓ کا گھرانہ بھی شامل ہے۔[۵]

۵۔ اسماعیل بن عمر بن کثیر الدمشقی: البدایۃ والنہایۃ، داراحیاء التراث العلمی، بیروت لبنان ط۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء، ۹۷/۳۔

نجران کے عیسائیوں میں سے ۲۰ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ضماد بن ثعلبہ الازدیؓ یمن کا مشہور کاہن مسلمان ہو گیا تھا۔[۶] قبیلہ بنی الاشہل۔[۷] تمیم و نعیم اور کچھ باشندگان ملک شام، حبشہ کے بہت سے لوگ وغیرہ۔ اس تفصیل کو پیش کرنے کی غرض یہ ہے کہ بعض کم علم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آپؐ کا مکی دور ناکامی کا دور تھا، آپ اس میں کچھ نہ کر پائے، اور دائرہ اسلام حد درجہ محدود تھا..... جب کہ ظاہر ہے کہ مکہ میں اسلام اور اہل اسلام کی پوزیشن دفاعی تھی نہ کہ اقدامی اور جوابی۔ مدینہ جیسی اسلامی ریاست کی تشکیل اور ماحول سازی مکمل طور پر مکہ مکرمہ سے ہی تکمیل پائی، عقبہ کی دونوں بیعتیں کا وجود عہد مکی میں ہی ہوا۔ بس نوعیت کا فرق ہے، مکی دور انقلابی جدوجہد کا ابتدائی مرحلہ تھا اور عہد مدنی اس انقلاب کی تکمیل و انتہاء کا مقام تھا۔

مختصر یہ کہ طریقۂ محنت کے مذکورہ چار امور میں سے دو: تلاوت آیات اور تزکیہ نفس کا بیشتر تعلق مکی دور سے ہے، اور تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کا مظہر قیام مدینہ اور ارض مدینہ ہے، یعنی مکی دور میں انقلاب اپنی تمام تر تمہیدات کے ساتھ مکمل تھا اور مدنی دور اس انقلابی کارروائی اور اس جدوجہد کا آخری نتیجہ ثابت ہوا۔

مدنی دور کا طریقۂ انقلاب

جب کفار نے مکہ میں مسلمانوں کا دائرہ تنگ کر دیا، تو ہجرت مدینہ کا حکم ہوا، جس کے پیچھے اصل ہدف تکمیل انقلاب اور انقلاب کے عملی نمونے کی تشکیل تھی۔ اس لیے آپ نے طریقہ کار بدل دیا۔ چنانچہ سب سے پہلے اجتماعیت کو قائم رکھنے اور اظہار وحدت کے لیے نماز جمعہ کا قیام عمل میں آیا اور آپ نے مدینہ میں نماز جمعہ ادا فرمائی، اس کے بعد چوں کہ آمد رسول سے قبل مدینہ کی بڑی آبادی مشرف باسلام ہو چکی تھی، دیگر باقی لوگوں سے بظاہر مسلمانوں کی جمعیت کو کوئی خطرہ لاحق نہ تھا؛ مگر قرب و جوار میں ہنوز اسلام ناشناس موجود تھے، جن میں کچھ شدت پسند اور غالی قسم کے مذہبی لوگ بھی تھے، جن میں پیش پیش یہودان مدینہ اور ان کے زبردست قبیلے بنونضیر، بنوقینقاع، بنوقریظہ تھے، جو اپنے جداگانہ قلعوں میں رہتے تھے اور تجارت و سود خوری کے سبب مالی اعتبار سے کافی مضبوط تھے۔ ان کے علاوہ کچھ عیسائی بھی تھے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر ہجرت کے پہلے سال میں تمام قوموں سے ایک

۶۔ امام مسلم: صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، باب تخفیف الصلاۃ، مکتبہ دار السلام ط: ۲، ریاض ۱۴۲۹ھ، ص ۸۱۳۔

۷۔ ابو الفرج نور الدین الحلبی: السیرۃ الحلبیۃ، دار الکتب العلمیۃ بیروت لبنان ۱۴۲۷ھ، ۱۹/۲۔

معاہدہ کیا (جس کے الفاظ سے اس کی نوعیت اور مقصد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے) کیوں کہ کسی بھی داعی انقلاب کے لیے افراد سازی اور تنظیم و تربیت افراد کے بعد ضروری ہوتا ہے کہ اگلے اقدام سے پیش تر ان کے تحفظ کا انتظام وخیال فرمائے؛ ورنہ پیش قدمی کے جنون میں تقلیل افراد یا ناراضگی و ناموافقت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اگرچہ نبی کے مصاحبین و حواری ان ظاہری عیوب سے بہت بلند تھے، مگر تسکین خاطر کے لیے لابدی تھا۔ لہذا اس معاہدے کا مقصد استحکام امن، قریش مکہ کی شرارتوں، سازشوں اور حملے سے تحفظ، یہود کی چالوں سے احتیاط، منادیان اسلام کو وعظ وانذار میں کھلی آزادی، اسلام کی وسعت، اور امن بسیط کا قیام تھا۔ پھر جب اس معاہدے پر مدینے کی تمام آباد قوموں کے دستخط ہوئے، تو آپؐ نے گرد و نواح کے قبائل کو بھی اس معاہدے میں شامل کرنا چاہا تاکہ ان کی آپسی خانہ جنگیوں کا انسداد ہو جائے اور قریش مکہ ان کو اہل اسلام کے خلاف ورغلانہ سکیں۔ چنانچہ آپؐ قرب و جوار میں تشریف لیے گئے اور آس پاس کے لوگوں کو اس معاہدہ میں شریک کیا۔

دیگر ابتدائی اقدامات

اسی طرح مدینہ پہنچ کر آپ نے اس انقلابی مشن کو منظم کرنے اور تقویت دینے کے لیے "مسجد نبوی" کی تعمیر فرمائی، جو ہر قسم کی اجتماعی ضروریات کی تکمیل میں کام آسکے، گرچہ اس کی اولین حیثیت عبادت گاہ اور ایک مسجد کی تھی لیکن وہ خانقاہ و درس گاہ بھی تھی، مجلس مشاورت اور پارلیمنٹ بھی تھی، گورنمنٹ ہاؤس کا مقام بھی تھی، تو وفود کے قیام کی جگہ بھی، اور مسلمانوں کے لیے اجتماع گاہ اور مرکزی مقام۔

دوسری چیز یہ کہ آپ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخات فرمائی، اور بعض مہاجر کو بعض انصار کا بھائی بنایا، جس کو تاریخ اسلام نے "مواخات" کی سنہری تعبیر سے محفوظ کیا ہے[۸]، اور انصار مدینہ نے رشتہ اخوت کو نبھاتے ہوئے دل کے دروازے کھول دیے، ان مہاجرین اور بے وطن مسلمانوں کو اپنے گھروں، دکانوں میں حصہ دار بنایا، حتی کہ اپنی بیویوں میں بھی تقسیم کا عمل فرما کر دو بیوی والے نے ایک پر ہی اکتفا کیا، قرآن نے ان کی اس شاندار ضیافت اور مہمان نوازی اور ایثار کی کھل کر تعریف فرمائی۔ اور تیسرا کام تطہیر اخلاق و تعمیل اوامر پر کاربند کرانا، تمام رسوم و رواج کا بندھن توڑ کر مرحلہ وار اسلامی

۸۔ اسماعیل بن عمر بن کثیر الدمشقی: البدایۃ والنہایۃ، ۲۲۶، دار احیاء التراث العلمی، بیروت، ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء، ۳/۲۲۷۔

احکام کا نزول اور اس کی اشاعت و عمل داری؛ چنانچہ باب احکام کی بیشتر آیات و روایات کا تعلق عہد مدنی سے ہے۔ چوتھا کام مسلمانوں کے لئے مدینہ میں الگ بازار قائم کیا تاکہ اقتصادی طور سے مسلمان مضبوط ہوں اور معاشیات کو کنٹرول کریں۔

مسلح تصادم اور معرکہ ٔ جنگ

جب انقلابی کارواں ہر قسم کی فکری، عملی، اخلاقی اور جسمانی و روحانی قوتوں سے لیس ہو گیا، اور آپ نے انقلابی عمل کے لیے تیار کر دیا تو وقت آیا اقدام کا۔ اب صرف صبر نہیں، بلکہ جوابی کارروائی بھی ہے۔ اب کف ّید کا نہیں بلکہ ضرب عنق کا حکم آیا، اور شدت و سختی کا حکم ہوا۔ تو آپ نے تلوار اٹھائی اور قرآن کی زبان میں ارشاد ہوا: ''جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی ہے اُن کو اجازت ہے (کہ وہ بھی لڑیں) کیونکہ اُن پر ظلم ہو رہا ہے اور اللہ (اُن کی مدد کرے گا وہ) یقیناً اُن کی مدد پر قادر ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے (انہوں نے کچھ قصور نہیں کیا) ہاں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب، اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو (راہبوں کے) خلوت خانے اور (عیسائیوں کے) گرجے اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں جن میں اللہ کا بہت ذکر کیا جاتا ہے ویران ہو چکی ہوتیں اور جو شخص اللہ کی مدد کرتا ہے اللہ اُس کی ضرور مدد کرتا ہے بیشک اللہ توانا اور غالب ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے''۔ (الحج: ۴۱،۳۹)۔ یہاں قتال کا حکم ہوا، البتہ اس میں بھی پہلے مرحلے وانقلابی دعوت اور اتمام حجت کے طور پر ''دعوت توحید'' لازم ہے۔ آیات بالا میں جہاں باری تعالی نے جہاد اور انتقام کا حکم دیا وہیں ان وجوہ پر بھی روشنی ڈالی جو حکم قتال کا سبب بنیں؛ مثلاً: مدافعت کرنے والوں کا مظلوم ہونا اور حملہ آوروں کا ظالم ہونا، جسے موجودہ دور کا قانون حفاظت خود اختیاری کے نام سے اجازت دیتا ہے، ان کو گھر سے بے گھر کرنا، املاک سے بے دخل کرنا، اور وہ بھی محض اختلاف عقیدہ کی بنیاد پر۔ اس معاہدہ استحکام کے سبب جو مسلمانوں نے یہود وغیرہ قبائل مدینہ سے کیا تھا، اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا گیا۔

قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کے مکمل غزوات و سرایا کی مجموعی تعداد بیاسی (۸۲) بیان کی ہے لیکن ان کے نتائج اور تفصیلات کے ضمن میں یہ وضاحت کی ہے کہ یہ تمام

لڑائیاں نہیں تھیں، بلکہ ان کے مختلف مقاصد تھے، جن کو اجمالاً دس میں شمار کرایا ہے۔ عنوان غزوات وسرایا کے تحت صرف لڑائیاں ہی درج نہیں کی گئیں بلکہ نبی ﷺ یا مسلمانوں کا ہر قسم کا سفر درج ہے۔ ہم اس نقشہ کے اندر اگر اصلی لڑائیوں کا انتخاب کرنے لگیں تو ان کا شمار بہت کم نکلے گا۔ جملہ غزوات وسرایا کے عنوانات درج ذیل ہیں:

اول: تکمیل معاہدات و تبلیغ اسلام ومواعظ کے لیے سفر۔ دوم: حملہ آور دشمنوں کے احوال کی دریافت۔ سوم: دشمن کو مرعوب کرکے اس کو حملہ آوری سے روکنا۔ چہارم: ڈکیتی پیشہ لوگوں کو سزا دینا۔ پنجم: ڈکیتوں کا تعاقب۔ ششم: غلط فہمیاں۔ ہفتم: بُت شکنی۔ نہم: جنگ دہم: دشمنوں کا تعاقب۔ یازدہم: لوکل یا پرسنل واقعات مقامی یا شخصی۔ اگر ان غزوات وسرایا کا جائزہ نقصان کے اعتبار سے لیا جائے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ان تمام حرکات کا مقصد فقط قتال یا جنگ نہ تھا، یا یہ کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔ قاضی منصور پوری لکھتے ہیں: ''مقتولین ہر دو جانب کی تعداد (۱۰۱۸) ہے، اور دشمنوں کی تعدادِ اسیران کافی معلوم ہوتی ہے یعنی ۶۵۶۴ اور چوں کہ ۶۰۰۰ صرف غزوہ حنین کے ہی تھے (جن کو نبیؐ نے از راہ لطف واحسان بلا کسی شرط کے آزاد فرما دیا تھا) اس لیے یہ تعداد بالکل کم ہو جاتی ہے''[۹]

اس مسلح تصادم کا نتیجہ فتح مکہ مکرمہ کی صورت میں نکلا اور انقلاب نبویؐ کی تکمیل کا اعلان کر دیا گیا کہ: ''کہہ دو کہ حق آگیا اور باطل نابود ہو گیا۔ بیشک باطل نابود ہونے والا ہے'' (بنی اسرائیل:۸۱)۔ یعنی حضور اکرم ﷺ نے جس کعبۃ اللہ اور مسجد حرام اور مکہ مکرمہ سے اپنے انقلابی مشن کا آغاز کیا تھا، اور جس نعرۂ توحید کو بلند کیا تھا، آج اس کی تکمیل ہو گئی۔ کعبہ کے اندر رکھے سارے بت اوندھے منھ گرا دیے گئے اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے وہ مقدس مقام ہمیشہ کے لیے حاصل ہو گیا، اور پھر قیامت تک کے لیے اس مقدس گھر میں بلکہ اس کے ارد گرد تک بت پرستی کی گنجائش ختم کر دی گئی، اور حدود مقرر کر دی گئیں۔

تعلیم کتاب وحکمت

قرآن کریم نے نبی پاک ﷺ کے جس مقصد بعثت اور طریقہ کار کو ذکر فرمایا ہے، اس میں تیسری اور چوتھی چیز ہے تعلیم کتاب وحکمت۔ کتاب سے مراد احکام وفرائض ہیں۔ چنانچہ احکام وفرائض

۹۔ قاضی سلیمان منصور پوریؒ: رحمۃ للعالمین، فرید بکڈپو دہلی، ط: ۱۹۹۱ء، ص: ۲۰۶۔۲۰۷، ۲۱۳۔

اور واجبات و شرائع کا نزول زیادہ تر مدنی دور میں ہوا، اکثر احکام مدنی عہد میں آئے، جن سے اہل اسلام کی مکمل تطہیر اور ان کو فکر و عمل کا مکمل نمونہ بنانا مقصود تھا۔ اکثر مدنی آیات احکام سے متعلق ہیں، اور تعلیم حکمت سے مراد شرائع و فرائض کے وہ اسرار و رموز ہیں جو بدقت نظر آئیں؛ چنانچہ درس گاہ نبوت کے تعلیم یافتگان نے علوم و حکمت کے دہانے کھول دیے، اور علوم و فنون کو پرواز عطا کیا اور پھر فرمادیا گیا کہ: ''جس کو حکمت مل جائے گویا کہ اس کو خیر کثیر مل گئی''۔ (بقرہ:۲۶۹)

تتمہ انقلاب

آپؐ نے وہ تمام صعوبتیں برداشت کیں جو کسی انقلابی دعوت اور اس کے داعی کے لیے ممکن ہو سکتی ہیں، جس کا صاف اور واضح بیان خود زبان رسالت سے یہ جاری ہوا کہ مجھے راہ خدا میں سب سے زیادہ اذیت دی گئی، اور اس انقلابی مشن کے لیے سب سے زیادہ ہراساں کیا گیا، اور نہ صرف آپ کو بلکہ اصحاب رسولؐ کو بھی ہر قسم کی جسمانی و روحانی تکلیف دی گئی بلکہ تکلیف رسانی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا گیا۔ آپ کو اور اصحاب کو لالچ دی گئی، ان پر زمین تنگ کی گئی، ان کے خلاف زبان و بیان کے نشتر کے ساتھ تیغ و سنان سے نعرۂ حق اور کلمہ حق کو دبانے کی کوشش کی گئی۔ چراغ حق کو ہمیشہ گل کرنے کی خواہش کی گئ، آپ کی بچیوں کے رشتے توڑوا دیے گئے، مقاطعہ کیا گیا، اہل اسلام اور ان کے حامیوں کا بائکاٹ کر کے ''شعب ابی طالب'' میں محصور رکھا گیا، حتی کہ ملک اور وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا اور پھر وہاں بھی چین سے رہنے نہیں دیا گیا بلکہ اپنوں کے صفایا اور صفحہ ہستی سے مٹانے اور اس نبوی انقلاب کو روکنے اور ختم کرنے کے لیے تجویزیں پاس ہوئیں، تحریکیں چلیں، باغیان اسلام اور دشمنان نبوت کو یکجا کیا گیا، احزاب اور گروہوں کی شکل میں یک بارگی حملہ کیا گیا، حدود حرم میں حاضری پر پابندی عائد کی گئی، مسلمانوں کی مرضی کے خلاف صلح نامے تیار ہوئے، اور سب سے بڑا جرم یہ کہ تمام قبائل قریش نے متفقہ طور پر حضرت رسول رحمتؐ کے قتل اور ان کے پاک وجود کے خاتمے سے اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کا منصوبہ بنایا اور آپ پر قاتلانہ حملہ کے لیے آپ کے گھر کا گھراؤ اور حصار بھی کر لیا۔ اس انقلابی مشن کی اشاعت اور اس کی کامیابی و عروج کی راہ میں ہر حربہ اپنایا گیا، اور انسانی وسعت کے مطابق اعداء اسلام نے ہر عملی جدوجہد کی۔ اس تناظر میں بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی مثبت اور تاریخی و آسمانی انقلاب کی نوعیت کیا ہوتی ہے، اور تمام تدابیر اور مساعی کے ساتھ مختلف اور جارحانہ سلوک کا سامنا کیوں کر

ہوتا ہے، اور پھر انصاف کے تقاضے سے کہا جاسکے کہ انقلاب نبوی کی تکمیل اور اشاعتِ اسلام بزور شمشیر وجود میں نہیں آئی۔

انقلابِ نبوی کی توسیع و نفاذ

مکی دور میں میدان محنت محدود و مخصوص تھا۔ ہجرت مدینہ کے بعد اکثر احوال تصادم و دفاع اور جنگ کے تھے، حتی کہ مکہ فتح ہوا جو تکمیل انقلاب کا عنوان تھا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد کی جنگیں خاتمہ اور قد غن لگانے کی نوعیت رکھتی ہیں، کیوں کہ اندرونِ عرب انقلاب مکمل ہو چکا تھا، اس لیے اب آپ نے بیرون عرب کا قصد فرمایا۔ اسی وجہ سے آپ نے صلح حدیبیہ (جس کو اصل فتح کہا جاسکتا ہے) سے قبل کوئی قاصد و مبلغ کہیں نہیں بھیجا، بلکہ صلح کے دوران بھیجنا شروع کیا، کیوں کہ انقلابی عمل کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ یہ ابتداء میں پھیلتا نہیں ہے، وہ ایک ہی جگہ پر اپنی جڑیں مضبوط کر کے اوپر ابھرتا ہے، وہ مکمل موقع شناسی اور حکمت عملی پر منحصر ہوتا ہے۔ لہذا آپ نے بیرون حجاز کا قصد فرمایا۔ ادھر مدینۃ الرسول اسلامی احکام و نظام کا ایک عملی خطہ بن کر قائم ہو چکا تھا، اور اس کے زیر نظام تعزیرات و حدود کی عملی مثالیں بھی از جانب خداوند باری قائم کر دی گئی تھیں تاکہ ان کے نفاذ و اجراء میں کسی قسم کا تردد و تذبذب دامن گیر نہ ہو۔ تاہم بیرون حجاز آپ کی خدمات کی نوعیت دو قسم کی ہے:

ایک طرف آپ نے اسلام کو ایک طاقت تسلیم کرنے کے نتیجے میں مختلف سیاسی، سماجی اور عوامی افراد و وفود کی شکل میں در نبوت پر حاضر ہوئے لوگوں کا استقبال کیا۔ ان وفود سے آپ نے انقلاب کی تکمیلی شکل کا سلسلہ رکھا، ان سے اسلامی نظام و نصاب اور حکمت عملی کے امور پر تذکرہ فرمایا۔

دوسری اہم چیز جس کو آپ کی کتابی و تحریری تبلیغ بھی کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے حلقۂ اسلام کو وسیع کرنے، منصب رسالت کی عمومیت و عالمگیریت کے تقاضے کے تحت اور اس انقلاب کو عالم گیر بنانے کے لیے مختلف بادشاہوں، حکمرانوں، اور سر برآوردہ اشخاص کو خطوط اور پیغامات ارسال فرمائے، جن میں قیصر روم، شاہ کسریٰ، شاہ حبشہ، حاکم اسکندریہ، صاحب یمامہ، شاہ غسان، شاہ عمان وغیرہ سر فہرست ہیں۔ یہ دعوتی و تبلیغی خطوط چنیدہ اصحاب کے ذریعے روانہ فرمائے۔ اسی طرح ان رؤسائے عرب کی جانب جو سرحد پر آباد تھے اور جنھوں نے ہنوز اسلام قبول نہیں کیا تھا، کی جانب سے مختلف رد عمل سامنے آئے، جن میں نمایاں تذکرہ شاہ غسان کا ہے جو ہرقل کی تابع داری میں تھا۔ اس بد بخت نے آپ کے قاصد و سفیر حضرت حارث بن عمیر رضی اللہ

عنہ کو شہید کر دیا تو حضورؐ نے ان کے قصاص کے لیے لشکر روانہ کیا اور ''غزوہ موتہ'' کا معرکہ ہوا۔[۱۰] اس کے بعد پھر حضورؐ کا آخری اور اتمامی مقابلہ ''غزوہ تبوک'' پیش آیا۔[۱۱] اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں تصدیر انقلاب کے مرحلے کا آغاز ہو گیا، اور آپ کی حیات میں ہی ''نبوی انقلاب'' کی تحریک اندرونِ عرب مکمل ہو کر بیرونِ عرب پہنچ گئی۔ پھر آپ نے اس کی ذمہ داری امت کے سپرد فرمائی کہ اب اس کی تکمیل و تعمیم کا اور اس کی تقدیم و تقدم کا مرحلہ ان کے ذریعے طے ہو۔[۱۲] یہی ان کی وجہ فضیلت اور یہی ان کا مقصدِ تخلیق ہے، جس کے قانونی اور آخری الفاظ یہ تھے: فليبلغ الشاهد الغائب (موجود غیر موجود تک پیغام پہنچادے)[۱۳]۔ اس لیے کہ عظیم نبی کی امت عظیم کام کے لیے ہی پیدا کی گئی ہے۔ اسے دیگر اقوام کی مانند فقط تعمیل اوامر یا عبادت کے دائرے تک محدود نہیں رہنا ہے، بلکہ اشاعت اسلام اور غلبہ دین مبین اور اعلاء کلمۃ اللہ ہی بحیثیت مسلمان فریضہ منصبی اور مذہبی تقاضہ ہے۔ اور اس کی تحریک کے لیے آپ نے جیش اسامہؓ کی تیاری فرمائی اور ہر حال میں اس کی روانگی کا حکم فرمایا، جس میں اجلہ صحابہ اور کبار اصحاب شامل تھے۔

انقلابِ نبوت کے امتیازات و خصوصیات

اس نبوی انقلاب کے چند بنیادی امتیازات ہیں، جن سے اس کے منہج، عمومیت و عالمیت، اور آفاقیت کا اندازہ لگانا آسان ہو جائے، اور اس بات کو باور کرنے میں تردد نہ ہو گا کہ یہ انقلاب تاریخی تھا، یہ کامیاب اور عظیم انقلاب تھا، ہمہ جہت اور مکمل انقلاب تھا، اور تاریخ انسانی کا عظیم ترین اور ہمہ گیر ترین انقلاب تھا:

دنیا کے انقلابات میں سے کوئی بھی دوسرا انقلاب ایک حیات انسانی کے عرصے میں پورا نہیں ہوا؛ بلکہ فکر دینے والے مر کھپ گئے، بعد میں کہیں وہ فکر پروان چڑھا اور اس کی بنیاد پر کہیں انقلاب آیا، جبکہ تاریخ

۱۰۔ ابو بکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ الکوفی: المصنف، الاحادیث والآثار، مکتبۃ دار التاج لبنان ط ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء، ۷/۴۱۲۔

۱۱۔ سلمان بن احمد ایوب الطبرانی: المعجم الکبیر، دار الصمیعی ریاض، ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۴ء، ۱۹/۴۳۔

۱۲۔ ڈاکٹر اسرار احمد: رسول انقلاب کا طریقہ انقلاب، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ط: ستمبر ۲۰۰۴ء، ص: ۵۳۔

۱۳۔ ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری: صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، باب الخطبۃ ایام منی، دار ابن کثیر / دار الیمامۃ دمشق، ۵: ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء، ۲/۶۲۰۔

انسانی کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ محیر العقول امر اور حد درجہ عظیم معجزہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے فرد واحد سے دعوت کا آغاز فرما کر فقط ۲۳ سال کے عرصے میں اسلامی انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچادیا، اور ایک وسیع و عریض خطہ پر ”دین حق“ کو اپنے سیاسی، سماجی، اور معاشی ڈھانچے سمیت بالفعل قائم و نافذ کر دیا۔[14]

تاریخ عالم میں محفوظ تمام داعیانِ انقلاب کے ذریعے برپا کیے گئے انقلابات جزوی اور محدود تھے۔ ان کا تعلق کسی خاص گوشہ حیات سے تھا، مثلاً: ”انقلاب فرانس“ سے سیاسی و حکومتی نظام میں اور ”انقلاب روس“ سے نظامِ معیشت کے تفصیلی ڈھانچے میں تبدیلی واقع ہوئی۔ نبوی انقلاب اس اعتبار سے منفرد اور لاثانی ہے کہ اس کا تعلق صرف مذہبی امور سے نہیں بلکہ اس سے پوری انسانی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی اور عقائد و نظریات، علوم وفنون، قانون واخلاق، تہذیب وتمدن، معاشرت ومعیشت اور سیاست و حکومت کے تمام گوشے متاثر ہوئے، اور ان میں تغیر و تبدل واقع ہوا۔ لہذا یہ انقلاب ہمہ جہت اور دیگر انقلابات جزوی تھے۔

انقلاب نبوی کے حالات و کوائف اور مکمل روداد موجود ہے، جو سراسر انسانی اقدار اور انسانی روایات پر مبنی ہے، جس میں اپنی ذات کے بجائے صرف انسانیت کی تعمیر و ترقی اور ان کی صلاح وفلاح کا منصوبہ اور خاکہ پیش نظر رہا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامیؒ نے نبی رحمتؐ کے آخری خطبے اور اس کی تاریخی اہمیت کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ یورپ کے ایک مشہور مورخ ”لارڈ ایکٹن“ نے فرانس کے ”منشورِ حقوق انسانی“ کے متعلق کہا تھا کہ کاغذ کا یہ ایک پرزہ دنیا کے کتب خانوں سے زیادہ وزنی اور ”نپولین“ کی قشون قاہرہ سے زیادہ پر شکوہ ہے۔ ایکٹن کی یہ رائے مبالغے سے خالی نہیں؛ لیکن (صرف) رسول اکرمؐ کے خطبۃ الوداع کے متعلق یہ کہا جائے کہ ”آسمان نے روز وشب کی ہزار کروٹیں بدلی ہیں؛ لیکن احترام انسانیت کے لیے اس سے زیادہ پُردرد اور پر خلوص آواز نہیں سنی تو یقیناً اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا“۔[15] اس انقلاب کی مکمل قیادت تنہا نبی رحمت ﷺ نے کی تھی۔ انقلاب کے تمام مراحل میں آپ کے سوا کوئی دوسرا قائد وداعی انقلاب نہ تھا۔

اس عالمی انقلاب کے حوالے سے مشہور مصنف ڈاکٹر مایکل ہارٹ نے لکھا ہے کہ: ”ممکن ہے کہ انتہائی متاثر کن شخصیات کی فہرست میں (حضرت) محمد کا شمار سب سے پہلے کرنے پر چند احباب کو حیرت

۱۴۔ ڈاکٹر اسرار احمد: نبی اکرمؐ کا مقصد بعثت:، مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ط: ۶؛ ۲۰۰۲ء، ص: ۴۸۔
۱۵۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی: تاریخی مقالات، ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۶۶/۱۳۸۵ء ص ۳۔

ہو اور کچھ معترض بھی ہوں لیکن یہ واحد تاریخی ہستی ہے، جو مذہبی اور دنیاوی دونوں محاذوں پر برابر طور پر کامیاب رہی۔ محمد نے عاجزانہ طور پر اپنی مساعی کا آغاز کیا اور دنیا کے عظیم مذاہب میں سے ایک مذہب کی بنیاد رکھی اور اسے پھیلایا۔ وہ ایک انتہائی موثر سیاسی رہنما بھی ثابت ہوئے۔ آج تیرہ سو برس گزرنے کے باوجود ان کے اثرات انسانوں پر ہنوز مسلم و گہرے ہیں۔ انہوں نے آگے لکھا ہے کہ ''ہم جانتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی میں عرب فتوحات کے انسانی تاریخ پر اثرات ہنوز موجود ہیں۔ یہ دینی اور دنیوی اثرات کا ایسا بے نظیر اشتراک ہے جو میرے خیال میں حضرت محمد کو انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ متاثر کن شخصیات کا درجہ دینے کا جواز بنتا ہے''۔[16]

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے اس نبوی انقلاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی طبیعتوں کا یہ زبردست انقلاب جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دست مبارک پر انجام پایا اور مسلمانوں کے ذریعے سے انسانی معاشرے میں پیش آیا، انسانی تاریخ کا انوکھا واقعہ تھا۔ اس انقلاب کی ہر چیز نرالی اور انوکھی تھی۔ اس کی سرعت، اس کا عمق اس کی وسعت وہمہ گیری، اس کی وضاحت اور فہم انسانی سے قرب، یہ سب اس محیر العقول واقعے کے نرالے پہلو تھے۔ یہ انقلاب دوسرے خارق عادات واقعات کی طرح کوئی پیچیدہ مسئلہ یا ناقابل فہم معمہ نہ تھا۔ علمی طریقے سے اس انقلاب کی تحقیقات کیجیے تاریخ انسانی اور معاشرہ انسانی میں اس کے اثرات کا مطالعہ کیجیے۔[17]

انقلابی عمل کے لیے بنیادی چیز اس انقلاب کے قائد وبانی کی سیرت و شخصیت کی جامعیت واولیت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ حضور رحمت عالم کی ہستی تمام کائنات کے لیے نمونہ حیات اور وجہ استناد ہے۔ آپ کے کسی گوشہ حیات سے بداخلاقی، بدعنوانی، بدکرداری یا اشتعال واختلاف کا کوئی شبہ بھی نہیں گزرتا ہے۔ انقلاب نبویؐ کا ہر اول دستہ یعنی اصحاب اخیار پاکیزگی کے اعلیٰ معیار پر قائم تھے۔

انقلاب نبویؐ حالات حاضرہ کے تناظر میں

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس انقلاب کی قیادت فرمائی اور حضرات صحابہ نے اس کی ترویج واشاعت اور استحکام

۱۶۔ Michael H. Hart, *The 100*, Carol Publishing Group, New York, 1993, pp.3,10

۱۷۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر: ، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ۲۰۱۰ء ص ۱۰۱۔

کے لیے ہر ممکن جدوجہد سے حق ادا کردیا، اور سلسلہ بسلسلہ یہ عمل جاری وساری رہا۔ بقول ڈاکٹر اسرار احمدؒ:

اسلام کا وہ اصل انقلابی فکر کیا ہے جس نے چودہ سو سال قبل ایک ریگزار خطہ میں جنم لیا تھا، جسے پوری دنیا نے تاریخ انسانی کا عظیم ترین، جامع ترین اور صالح ترین انقلاب تسلیم کیا ہے، اور جس کے نتیجے میں خلافت راشدہ کی صورت میں وہ نظام عدل اجتماعی، خواہ تھوڑی مدت کے لیے سہی، لیکن بالفعل قائم ہو گیا تھا، جس میں انسانی حریت، اخوت اور مساوات کی جملہ اقدار کو نہایت صحیح اور موزوں نسبت و تناسب اور توازن و اعتدال کے ساتھ سمودیا گیا۔[۱۸]

موجودہ دور بھی اس کا مقتضی ہے کہ اس نبوی انقلاب کو زندہ کیا جائے، اور اس کے تقاضوں پر لبیک کہا جائے، جبھی اس امت میں پیدا ہونے کی احسان شناسی ہوگی، ورنہ ہم بھی ان قوموں کی فہرست میں ہوں گے جنہوں نے اپنے نبی کی قدر دانی نہیں کی حالاں کہ اس عظیم اور عالمی نبی کے طفیل اس امت کو جو مقام ومرتبہ حاصل ہوا اور خدا کی جانب سے جس اعزاز واکرام اور بخشائش کا معاملہ ہوا، اور اس کے عوض صرف اتنا مطالبہ کہ کلمہ الٰہی کو بلند کیا جائے، اس کا لازمی تقاضہ بنتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے طریقہ کار اور نبوی انقلاب کے بنیادی واساسی منہج وحکمت عملی پر آخری دم تک کاربند ہوا جائے۔ اس کے لیے اسی طریقہ کار کو زندہ کرنا ہوگا جو منہج کے بیان کے تحت مذکور ہوا۔ چنانچہ پہلی چیز اعتقاد اور عقیدہ کی پختگی ہے۔ مسلمانوں کے لیے توحید کا عقیدہ اور اس کی قوت اور قلب میں اس کا رسوخ حد درجہ لازم ہے۔ یہ تمام امور کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات سے اس درجہ وابستگی اور اس کی صفات کا اس درجہ یقین ہو کہ اس کی ذات سے براہ راست استفادہ کرسکے۔

اس کے لیے مسلمانوں کو ایمان اور اسلام کا فرق سمجھنا ہوگا اور ارشاد نبوی: ”جددوا ایمانکم“[۱۹] پر غور کرنا ہوگا۔ دوسری چیز ہے صبر واستقامت: اعلاء کلمۃ اللہ کی راہ میں افراد یا حکومتوں کی جانب سے پیش آنے والے مسائل پر صبر اور احکام خداوندی اور اتباع رسول پر استقامت وعزیمت۔ تیسری چیز: بہ حیثیت امت اجتماع واتحاد اور تنظیم آج بھی ممکن ہے۔ اس کے لیے قرآن کے اس واقعہ سے عبرت لینی چاہیے: ”کہہ دو کہ اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی) ہے اُس کی

۱۸۔ ڈاکٹر اسرار احمد: اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید وتعمیل:، مکتبہ خدام القرآن لاہور، ب۔ت۔، ص ۷۹۔

۱۹۔ امام احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی: مسند احمد،، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت لبنان ۱۴۲۱/۲۰۰۱، ۳۲۸/۱۴۔

طرف آؤ، وہ یہ کہ اللہ کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے"۔(آل عمران:۶۴)۔اس کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ رسول اکرمؐ کا آلہ انقلاب "قرآن حکیم" ہے، اور آپ کے طریقۂ انقلاب کا دائرہ قرآن کریم کے ارد گرد ہی ہے۔ تو امت کو قرآن کی بنیاد پر مجتمع کیا جاسکتا ہے اور قرآن کی مقناطیسیت اور سحر بیانی کے اثر سے رجوع، تنظیم افراد، تربیت افراد، اور صبر واستقامت اور دیگر تمام وہ امور زندہ اور ان پر عمل پیرا ہونا اور کرنا ممکن ہے جو تحریک انقلاب کے لیے لابدی وناگزیر ہیں۔ نبوت کے مقاصد اربعہ: تلاوت آیات، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ نفوس کا بھی نسخہ واحدہ رجوع الی القرآن ہے۔ اقدام اور پیش قدمی کے لیے فریضہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کو زندہ کیا جائے، اور اس سلسلہ میں وارد مضامین حدیث اور آیات قرآنیہ کو بغور دیکھا جائے، اور ان کی بنیاد پر امت کی تشکیل ہو۔[20]

عصر حاضر میں انقلاب نبوی کی معنویت

انقلاب نبوی کی اہمیت وضرورت، افادیت، اس کی عالمگیریت وابدیت کا لازمی تقاضہ ہے کہ ہر عہد میں اس چشمۂ صافی اور گنج گراں مایہ سے استفادہ اور رہنمائی حاصل کی جائے۔ سرور دوعالم کی حیات، انقلاب آفریں سیرت ہے۔ آپ کی سیرت ایک فرد کی نہیں بلکہ وہ ایک تاریخی طاقت کی داستان ہے۔ آپ سراپا نمونہ زندگی اور مثال ہیں۔ خالق کائنات نے اس کے لیے ابدی اعلان فرمادیا: "لقد کان لکم فی رسول الله اسوۃ حسنۃ" (تمہارے لئے اللہ کے پیغمبر میں اسوۂ حسنہ ہے)(سورہ احزاب:۲۱) بلکہ خود زبان ترجمان رسالت نے واضح فرمایا کہ :لن یستکمل مؤمن ایمانہ حتی یکون هواہ تبعالماجئتکم بہ۔[21] (کسی مؤمن کا ایمان مکمل نہیں ہوگا جب تک اس کی خواہشات میرے پیغام کے مطابق نہ ہوں) رسول اللہ ﷺ کی ذات ستودہ صفات سے رہنمائی اور فیض یابی تمام مسائل کا حل اور ہر مشکل سے خلاصی کا واحد راستہ ہے۔ ہر وقت اور ہر حال میں اس کی معنویت نہ صرف عقیدت مندانہ بلکہ بنظر انصاف موجب خیر وبرکات اور باعث امن وامان ہے۔ موجودہ حالات اور عصرِ حاضر کی مشکلات کے لیے سیرت نبوی سے مراجعت واتباعِ سنت پہلے سے کہیں زیادہ

۲۰۔ڈاکٹر اسرار احمد: منہج انقلاب نبوی، مکتبہ خدام القرآن، لاہور، ط۹: م۱۹۹۹، ص:۱۵۶۔۱۵۷۔

۲۱۔ابو بکر احمد بن الحسین البیھقی: المدخل الی السنن الکبری، دار السیر قاہرہ، ط:۷، ۱۴۳۷/۲۰۱۷، ۶۱۸/۲۔

ناگزیر و لازم ہو گئی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے: انا کنا اذل قوم فاعزنا اللہ بالاسلام فمہما نطلب العزة بغیر ما أعزنا اللہ بہ أذلنا اللہ بہ۔[۲۲] یعنی ہمیں عزت و رفعت دامن اسلام سے وابستہ رہنے کی بنیاد پر ملی ہے، ورنہ ہم وہ لوگ تھے جن کی کوئی شناخت نہ تھی، اور آج بھی ہم اگر اس طریقہ کے سوا عزت و شوکت کے متلاشی ہوں گے جسے حضرت محمد ﷺ لے کر آئے تھے، اور جو قرآن نے اور ہمارے دین نے ہمیں سکھایا ہے تو ہم رذالت و پستی کے اسی دلدل میں جا پھنسیں گے۔ یہی حقیقت ہے کہ آج مسلمان ذلت و انحطاط کے جس دور سے گزر رہا ہے اس میں سب سے بنیادی سبب وہی ہے جس کی جانب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اشارہ فرمایا کہ آج کا مسلمان طریقۂ رسالت سے روگردانی کر کے کامیابی و کامرانی ڈھونڈ رہا ہے، اور پھر حیران ہے کہ اس کی منزل تک رسائی کیوں نہیں! بالیقین ہمارے پاس مشکاۃ نبوت ہے۔ اس سے تاریکی کے درمیان راستے بنائے جاسکتے ہیں۔ اس آفتاب و ماہتابِ رسالت اوور سراج منیر اور نور مبین کے طور و طریق اور طرز زندگی کو اختیار کر کے ہر مشکل کو حل کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ عالم کے مطالعے اور جائزے کے بعد بلا خوف و تردد یہ بات کہنے کی گنجائش ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی ذات ستودہ صفات ہی تمام انسانوں کے لیے اسوۂ حسنہ اور کامل و جامع نمونہ ہے، جس کی اتباع افراد انسانی کی تعمیر، کردار سازی، قوم و ملت کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کی تنہا ضامن ہے، مسائلِ حیات اور مشکلات کا واحد حل ہے، امن و مساوات کے قیام کا تنہا لائحہ عمل، اخلاقی و روحانی، سیاسی و معاشرتی، اقتصادی و تمدنی ترقی کا کامیاب ذریعہ ہے، انفرادی و اجتماعی بلکہ مجموعی طور پر بہترین نظامِ زندگی، کامل دستورِ حیات، اور نوعِ انسانی کے لیے سفینۂ نجات و باعثِ خیر و برکات ہے۔

سیرت نبوی سے عصرِ حاضر میں استفادہ و رہنمائی، و فیض یابی، اور موجودہ حالات میں سیرت رسول کی عصری معنویت کا اندازہ لگانا ہو گا۔ ہر حال میں امت کے تمام مسائل کا حل اسی نہج اور اسی طریق سے ممکن ہے جو طریقہ مخاطبین اولین کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ حضرت امام مالکؒ نے اس کا نسخہ اکسیر یہ بتایا تھا: "لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا ما اصلح اولہا"[۲۳] یعنی اس امت کے اگلوں کی صلاح و فلاح کا نسخہ وہی ہے

۲۲۔ ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم النیسا پوری: المستدرک علی الصحیحین، ۱/۱۳۰، دار الکتب العلمیۃ بیروت لبنان، ط: ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۰ء، ۱/۷/۲۳۷۔

۲۳۔ محمد بن ابو بکر شمس الدین ابن قیم جوزی: اغاثۃ اللھفان من مصاید الشیطان: دار المعرفۃ بیروت لبنان ط ۲:

جو اس کے پچھلوں کا رہا تھا۔ مولانا وحید الدین خاںؒ "پیغمبر انقلاب" میں رقم طراز ہیں:

یہی معاملہ اسلامی انقلاب کا ہے، وہ بھی خدا کے پیدا کردہ مواقع کو سمجھنے اور ان کو استعمال کرنے سے ظہور میں آتا ہے، نہ کہ خود ساختہ قسم کی اچھل کود مچانے سے، صدر اول میں جو انقلاب آیا وہ اس لیے آیا کہ خدا کے کچھ بندوں نے اپنا پہیہ خدا کے پہیے سے ملا دیا، اس کے برعکس موجودہ زمانے میں ہماری تمام قربانیاں اس لیے رائگاں چلی گئیں کہ ہم نے خدائی منصوبہ کے ساتھ موافقت نہیں کی؛ بلکہ خود ساختہ راہوں میں غیر متعلق قسم کی ہنگامہ آرائیاں کرتے رہے۔[۲۴]

خالق کائنات نے جب ختم نبوت کا اعلان کر دیا تو اس نبی خاتم الانبیاء میں وہ تمام اوصاف و کمالات رکھے جن سے ہر حال، ہر شعبۂ حیات میں استفادہ کر کے نظامِ عالم کو بہتر طریقہ پر رکھا جا سکتا ہے اور ارشاد باری کی تکمیل و تفسیر اور تعبیر بھی ممکن ہو سکے گی: "وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تا کہ اس (دین) کو (دنیا کے) تمام دینوں پر غالب کرے اگرچہ کافر ناخوش ہی ہوں" (سورۃ التوبۃ:۳۳)۔ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

اسلام کا غلبہ باقی ادیان پر معقولیت اور حجت و دلیل کے اعتبار سے، یہ تو ہر زمانے میں بحمد اللہ نمایاں طور پر حاصل رہا ہے۔ باقی حکومت و سلطنت کے اعتبار سے وہ اُس وقت حاصل ہوا ہے یا ہوگا، جب کہ مسلمان اصول اسلام کے پوری طرح پابند اور ایمان و تقوی کی راہوں میں مضبوط اور جہاد فی سبیل اللہ پر ثابت قدم تھے یا آیندہ ہوں گے اور دین حق کا ایسا غلبہ کہ باطل ادیان کو مغلوب کر کے بالکل صفحہ ہستی سے محو کر دے۔ یہ نزول مسیح علیہ السلام کے بعد قرب قیامت کے ہونے والا ہے۔[۲۵]

۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء ص: ۲۰۰۔

۲۴۔ مولانا وحید الدین خاںؒ: پیغمبرِ انقلاب، المکتبۃ الاشرفیۃ، جامعہ اشرفیہ لاہور، سال اشاعت: ۱۹۸۳، ص: ۸۲

۲۵۔ مولانا شبیر احمد عثمانی: ترجمہ شیخ الہند، تفسیر عثمانی، ناشر: مدرسہ معاذ ابن جبل مسجد ابراہیم، وادی اسماعیل علی گڑھ، یوپی، ب۔ت، سورۃ التوبۃ؛ آیت: ۳۳، حاشیہ: ۲

اقبال سہیلؔ کے نعتیہ قصائد

ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی

سینیر اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر

pervezahmed@cukashmir.ac.in

دیارِ شبلی کا وہ سپوت، جسے خطۂ اعظم گڑھ کے لوگ ''اقبال سہیلؔ'' کے نام سے جانتے ہیں، اس کے اقبال کا پرچم ہمیشہ بلند رہا اور اس کی رخشندگی ہمیشہ قائم رہی۔ ایسے ذکی، زود گو، فی البدیہہ شعر کہنے والے شاعر کم ہی ہوتے ہیں۔ ان کی ذہانت و فطانت کے قائل اکابرین علم و دانش بھی ہیں۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ''نعت'' پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مدح، تعریف، توصیف اور خصائص کے منظوم بیان کو کہا جاتا ہے۔ اقبال سہیلؔ کے نعتیہ قصائد کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نعتیہ کلام میں وہ ان تمام امور اور حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہیں جس کا ذکر درج بالا سطور میں کیا گیا ہے۔ ان کی حمدیہ، نعتیہ اور منقبتیہ شاعری میں حفظ مراتب کا پورا لحاظ دیکھنے کو ملتا ہے اور ان کی شاعری میں ان تینوں اصناف کے ڈانڈے ایک دوسرے میں گڈمڈ نہیں ہوتے۔

نعت گوئی کا آغاز کب ہوا؟ اس کے بارے میں حتمی طور سے کچھ کہنا مشکل ہے پھر بھی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کے چچا ابو طالب نے پہلے پہل نعت کہی اور اصحاب میں حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہلے نعت گو شاعر اور نعت خواں تھے۔ اسی بنا پر انھیں شاعرِ دربارِ رسالت بھی کہا جاتا ہے۔

نعتیہ شاعری کی روایت عربی اور فارسی شاعری میں ابتدائی دور ہی سے رہی ہے۔ اسی طرح اُردو شاعری میں بھی دکنی عہد سے لے کر عہد حاضر تک اکثر و بیشتر شعرا نے حمد، نعت و منقبت میں طبع آزمائی کی ہے لیکن بعض شعرا نے اسے اپنا خاص موضوع بنایا اور اردو کی نعتیہ شاعری کو شاعرانہ عظمت سے ہم کنار کیا۔ اس سلسلے میں محسنؔ کاکوروی، احمد رضاؔ خاں بریلوی اور اقبال سہیلؔ وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اقبال سہیلؔ کے نعتیہ قصائد کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان کی طبعِ رسا کو اس سے فطری ہم آہنگی تھی۔ انھوں نے اپنے پیش رو نعت گو شعرا کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اُردو کی نعتیہ شاعری

کے اُفق کو مزید وسعت بخشی اور فکر و فن کے اعتبار سے اسے نیا انداز و آہنگ عطا کیا۔ استاد یعنی علامہ شبلی کی صحبت نے ان کے شعور کو جلا اور پختگی عطا کی۔ اسی شعور نے ان کے نعتیہ کلام میں حقیقت و واقعیت کا رنگ بھرا۔

نعت کے لیے صرف عقیدت ہی نہیں بلکہ سیرت اور تاریخِ اسلام پر گہری نظر اور واقعات و روایات کے بارے میں بھی صحیح علم نہایت ضروری ہے۔ سہیلؔ کی شاعری میں ان بنیادی خصوصیات کے ساتھ ساتھ آداب فن کا بھی پورا التزام ہے۔ ہمارے اکثر نعت گو شعرا نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے اسی طرح کا لب ولہجہ اور انداز بیان اختیار کیا ہے جو غزلیہ شاعری میں مجازی محبوب کے لیے رائج ہے۔ اس کے علاوہ مبالغہ آرائی کی وجہ سے ان کے یہاں اعتدال کی کمی بھی اکثر نظر آتی ہے۔ فی زمانہ نعت گوئی کا معاملہ تو مدینے کی گلیاں، گنبدِ خضرا کا دیدار، حضور پاک کی شخصیت کے چند واقعات پر آکر ٹھہر گئی ہے۔ اقبال سہیلؔ نے اس روش سے ہٹ کر تمام انبیاء و رسل کی عظمت کا پاس رکھتے ہوئے آپؐ کے پیغمبرانہ مرتبے، اوصاف، سیرت، جلال و جمال کے شایانِ شان الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان کا ایک نعتیہ قصیدہ ''معراج'' کے عنوان سے ہے، جس میں انھوں نے معراج کے واقعے کو نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔ مثال کے لیے چند منتخب اشعار دیکھیے:

وہ جسمِ پاکؐ خود سر تا قدم پیکر تھا نورانی
تو پھر معراج میں کیا بحث روحانی و جسمانی
حریمِ امّ ہانیؓ میں حضورؐ آرام فرما تھے
درِ دولت پہ قُدسی و ملک تھے محوِ دربانی
ادب سے آکے جبریلِ امیں نے یہ گزارش کی
کریں سرکار بزمِ نور تک تشریف ارزانی
براقِ برق پیکر لے چلا یوں ذاتِ انورؐ کو
فضا میں تیر جائے جس طرح بجلی کی تابانی
حضور اس طرح گزرے گنبدِ مینائے گردوں سے
نظر جس طرح شیشے سے گزر جائے بہ آسانی
ملائک اور رُسل صف بستہ استقبال کو آئے
اٹھا افلاک میں ہر سمت شورِ تہنیت خوانی

براقؔ و جبرئیلؑ آخر رکے سدرہ کی منزل پر
کہ تھی یہ انتہائے سرحدِ اقلیمِ امکانی
یہاں سے لے چلیں پھر آپؐ کو موجیں تجلی کی
وہ رفرف ہو کہ انوارِ ازل کا جوشِ فیضانی
سوادِ لامکاں تک رک گیا رَفرَف کہ اس کو بھی
کہاں اس خلوتِ وحدت میں اذنِ گرم جو لانی
کسی نے لے لیا خو د بڑھ کے آغوشِ محبت میں
ہوا ملکِ قدَم خلوت سَرائے حسنِ امکانی
ظلال و ذات میں پھر کیا ہوا اللہ ہی جانے
کہ ہے یہ مر حلہ ما فوقِ ادراکاتِ اِنسانی
بجز ذاتِ مُطھّر یہ شرف کس کو ہوا حاصل
بجز صدّیق اکبرؓ یہ حقیقتِ کس نے پہچانی
خِرد عاجز، نظر خیرہ، زباں کَج مَج، بیاں قاصِر
زمینِ نعت میں کیا دیجیے دادِ سخن دانی

یہ ایک طویل ونہایت عمدہ قصیدہ ہے، جس کا لطف شروع سے آخر تک پڑھنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ درج بالا سطور میں منتخب اشعار کی تعداد کچھ زیادہ ہو گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قارئین ان منتخب اشعار کے مطالعے سے قصیدے کے رنگ و آہنگ، شاعر کے تخیل کی بلند پروازی، اس کا مطالعہ ومشاہدہ، بندشِ الفاظ اور کیفیت کا اندازہ لگا سکیں۔ اس نعت میں سہیلؔ نے افراط و تفریط سے دور رہتے ہوئے، جس جذبے اور احترام کے ساتھ اپنے خلوص و عقیدت کا نذرانہ پیش کیا ہے، اس کی مثال اُردو شاعری میں کم ہے۔ اس نعت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مرزا احسان بیگ ''ارمغانِ حرم'' میں لکھتے ہیں:

> عام نعت گویوں نے اتنا ضرور بتایا کہ بُراق و جبرئیلؑ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ کر رک گئے، اس سے آگے قدم رکھنے کی مجال نہ تھی، لیکن یہ نہ بتا سکے کہ پھر اس کے بعد بارگاہِ قدس تک پہنچانے کا نازک فرض کس کے سپرد ہوا۔ اس کا ادراک صرف سہیلؔ ہی ایسے (جیسے) عالی نظر شاعر کی قوتِ

متخیلہ کر سکتی تھی[۱]۔

مرزا احسان بیگ نے درست کہا ہے کیوں کہ اقبال سہیلؔ کے نعتیہ قصائد پڑھتے ہوئے اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ واقعی انہوں نے نعت گوئی کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے یہاں رسول پاک کی وہی صفاتِ حسنہ اور فضائل انسانی ملتے ہیں جو قرآن و حدیث اور تاریخ اسلام میں موجود ہیں۔ سہیلؔ نے تمام انبیاءؑ ورسل کی عظمت کا پاس رکھتے ہوئے آپؐ کے جلال و جمال کے شایانِ شان الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس قصیدے کے مطالعے سے قاری کو اندازہ ہوگا کہ وہ ذاتِ اقدسؐ کن کمالات کی جامع تھی، جس کی روحانی جلالت و عظمت کے سامنے کفر و باطل کی تمام طاقتیں سرنگوں ہو گئی تھیں۔

معراج کے واقعے کو بیان کرتے وقت، ہماری روز مرہ کی عام انسانی زندگی سے تشبیہ لے کر اقبال سہیل نے اس میں مزید خوبی پیدا کر دی، ساتھ ہی اپنی تخیل آفرینی کا ثبوت بھی فراہم کر دیا۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ جس دور میں یہ قصیدہ کہا گیا، اس وقت ہندستان میں اس بات کی کافی بحث چل رہی تھی کہ حضورِ پاک بہ نفس نفیس معراج کو گئے تھے یا انھیں خواب میں دیدار کرایا گیا تھا۔ اس بحث کو انھوں نے درج ذیل شعر سے ختم کرنے کی کوشش کی:

وہ جسم پاکؐ خود سر تا قدم پیکر تھا نورانی
تو پھر معراج میں کیا بحث روحانی و جسمانی

اسی طرح معراج کے لیے عرشِ معلی تک جانے میں آپؐ کو کتنا وقت لگا؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ رہا کہ: ''فضا میں تیر جائے جس طرح بجلی کی تابانی''۔ وہ آسمان سے کس طرح گزرے؟: ''نظر جس طرح شیشے سے گزر جائے بہ آسانی؟'' یہ تشبیہیں جو مذکورہ اشعار میں استعمال کی گئی ہیں، وہ بڑی نازک و لطیف ہیں اور ہماری روز مرہ کی زندگی سے لی گئی ہیں۔ غیر مجسم چیزوں کو مجسم چیزوں سے تشبیہ دینا، شاعری میں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے لیکن اقبال سہیلؔ نے اپنے تخیل، مشاہدے، تجربے اور عقیدت سے وہ بھی کر دکھایا۔ اس کا لطف نکتہ شناس اور سخن فہم حضرات ہی جانتے ہیں کہ جب اس طرح کی چیزیں ہمارے مطالعے میں آتی ہیں تو کیا کیفیت ہوتی ہے؟ مذکورہ نعتیہ قصیدے میں انھوں نے معراج کے واقعے سے متعلق تمام واقعات کو مکمل طور پر پیش کرنے کے علاوہ حضورِ پاک ﷺ کے تمام اوصاف کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

---

[۱] ارمغانِ حرم، ص: ۵۳

اسی طرح ان کا ایک اور نعتیہ قصیدہ اسی زمین میں ہے، اس سے بھی چند شعر ملاحظہ ہوں:

کرے تارِ شعاعی لاکھ اپنی سعیٔ امکانی
رفو ہوتا نہیں اب صبح کا چاکِ گریبانی
اِدھر دوشیزہ کرنوں کا نکلنا سمتِ مشرق سے
اُدھر بزمِ جہاں سے رخصتِ شمعِ شبستانی
کہاں کا دشتِ ایمن ، طور کیا، برقِ تجلی کیا
یہ سب کچھ تھی جمالِ مصطفٰی کی پر تو افشانی
محمدؐ وہ کتابِ کون کا طغرائے پیشانی
مُحمدؐ وہ حریمِ قدس کا شمعِ شبستانی
محمدؐ یعنی وہ حرفِ نخستیں کلکِ فطرت کا
محمدؐ یعنی وہ امضائے توقیعاتِ ربّانی
وہ فاتح جس کا پرچم اطلسِ زنگاریٔ گردوں
وہ اُمیؐ جس کے آگے عقلِ کل طفلِ دبستانی
وہ ناطق جس کے آگے مہر بر لب بلبلِ سد رہ
وہ صادق جس کی حق گوئی کا شاہد نطقِ ربّانی
وہ عادل ، جس کی میزانِ عدالت میں برابر ہے
غبارِ مسکنت ہو، یا وقارِ تاجِ سلطانی
تراشہ جس کے ناخن کا ہلالِ آسماں منزل
غُسالہ جس کے تلوؤں کا زُلالِ آبِ حیوانی
تعالَی اللہ ذاتِ مصطفٰےؐ کا حسنِ لاثانی
کہ یکجا جمع ہیں جس میں تمام اوصافِ امکانی
دعائے یونسی، خلقِ خلیلی، صبرِ ایوبی
جلالِ موسوی، زہدِ مسیحی، حسنِ کنعانی
خدا جانے خود اس سرکار کا کیا مرتبہ ہوگا
غلامِ بارگہ جس کے کہیں مَا اَعظَمِ شَانِی

یہ قصیدہ ۵۳ اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں بھی آنحضرت صلعم کی شخصیت کے جملہ اوصاف کو

اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ درج بالا منتخب اشعار پورے نعتیہ قصائد سے نقل کیے گئے ہیں، جن سے شاعر کے تخیل، تفکر، تصور، مطالعے، لفظی ذخیرے اور فنِ شاعری کا اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں ابھی تک ہم نے دو الگ الگ قصیدوں سے اشعار نقل کیے ہیں مگر حسن اتفاق سے دونوں ہی بحرِ ہزج مثمن سالم میں ہیں۔ یہ وضاحت اس لیے کرنی پڑی کہ دونوں قصیدوں کے قافیے ایک جیسے ہی ہیں ورنہ اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں پڑتی۔

سہیل نے اپنے نعتیہ کلام میں حقیقت نگاری کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں تخیل کی رنگ آمیزی اور فن کی صناعی اس درجہ نہیں ہے کہ حقیقت اس میں گم ہو کر رہ جائے۔ انھیں معانی کی ترسیل کا سلیقہ آتا ہے۔ ان کے خیالات میں ابہام نہیں بلکہ وضاحت ہے۔ ان کا اندازِ بیان روشِ عام سے الگ ہی نہیں بلکہ ان کے بیان میں ایک شانِ تمکنت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے نعتیہ کلام پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے افتخار اعظمی لکھتے ہیں:

> وہ فن کے اسرار و رموز سے آگاہ ہیں، اسی بنا پر ان کے یہاں مواد و صورت کا معتدل امتزاج ہے۔ ژولیدہ بیانی اور پریشاں خاطری سے ان کا کلام پاک ہے۔ ان کے یہاں عالمانہ اظہارِ فصاحت اور لب و لہجہ کا وقار ہے۔ ان کے نعتیہ قصائد میں تازگی و توانائی، متانت و جزالت، شادابیِ خیال، بندش کی دلآویزی، الفاظ کی مرصع کاری اور صوتی تناسب سبھی کچھ پورے طور پر موجود ہے[۲]۔

سہیل کے نعتیہ قصائد میں عربی و فارسی کے الفاظ اکثر استعمال ہوتے ہیں لیکن ان کے یہاں الفاظ کی بندش، تصورات کا تسلسل اور واقعات کا تناسب ایسا ہوتا ہے کہ خیالات سیلِ رواں کی مانند بہتے نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے قصائد میں الفاظ غیر مانوس نہیں لگتے۔

ان کا ایک اور طویل نعتیہ قصیدہ بہ عنوانِ ''موجِ کوثر'' ہے۔ اس میں عربی و فارسی تراکیب کی بہتات کے باوجود الفاظ کی مناسب ترتیب اور قافیہ و ردیف کی ہم آہنگی کی وجہ سے جذبے کا بہاؤ اور نغمگی قابلِ دید ہے۔ اس قصیدے کے بھی چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

اَحمد مرسَل، فخرِ دُو عالَم، صلّی اللہ علیہ و سلم
مظہرِ اول، مرسِلِ خاتَم صلّی اللہ علیہ و سلم
عالمِ ناسوتی کا مجاہد، شاہد لاہوتی کا مشاہد

۲۔ ارمغانِ حرم، ص: ۲۴

شان میں اَرفع، صبر میں اَقوم صلّی اللہ علیہ وسلم
شرحِ اَلم نَشرَح وہ سینہ، برقِ تجلی کا گنجینہ
جگمگ جگمگ، چم چم چم چم صلّی اللہ علیہ وسلم
جتنے فضائل، جتنے محاسن، ممکن میں ہو سکتے تھے ممکن
حق نے کیئے سب اس میں فراہم صلّی اللہ علیہ وسلم
علمِ لدُنّی، شانِ کریمی، خُلقِ خلیلیؑ، نطقِ کلیمیؑ
زہدِ مسیحاؑ، عفّتِ مریمؑ صلّی اللہ علیہ وسلم
فرد و جماعت، امر و اطاعت، کسب و قناعت، عفو و شجاعت
حل کیے جو اسرار تھے مبہم صلّی اللہ علیہ وسلم
ربط و تصادم، طوع و تحکم، فقر و تنعّم، عدل و ترحم
سب کے حدود بتائے باہم صلّی اللہ علیہ وسلم
حفظِ مراتب، پاسِ اخوت، سعی و توکل، رفق و فتوت
تِلکَ حدود اللہ میں مُنضَم صلّی اللہ علیہ وسلم
بعدِ خدا ہر ایک سے افضل، اشرف و اکمل، اطیب و اجمل
اصدق و اعدل، اجود و احکم صلّی اللہ علیہ وسلم

یہ قصیدہ ۸۶ اشعار پر مشتمل ہے اور ردیف کا تو کہنا ہی کیا ہے! مذکورہ نعتیہ قصیدے کے مطالعے سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر کے دل میں اُس جامع کمالات شخصیت کی محبت کا ایک دریا موجزن ہے اور وہ اس بات کی کوشش میں ہے کہ کس طرح حضور پاکؐ کی تمام صفات کا احاطہ کر دیا جائے۔ اس قصیدے کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں شاعر نے رسولِ پاک صلعم کی شخصیت، عظمت و صفات کے ذکر کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدین اور اسلامی تاریخی واقعات و احادیث کا ذکر بھی مراتب کے اعتبار سے کیا ہے۔ وہ شریعت کی حدوں سے کبھی تجاوز نہیں کرتے۔ اس نعتیہ قصیدے میں خلفائے راشدین کے ساتھ ساتھ بہت سے صحابیوں کے نام بھی بہ لحاظِ مراتب آئے ہیں۔ جیسے:

خلفا چرخِ ہدیٰ کے انجم، رضیَ اللہ تعالیٰ عنہم
آپ جہاں کے ہادیِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلم

سیّدنا صدیقِؓ اکبر، پہلے مصدّق، پہلے مبشر
اُمّتِ مرحومہ میں ارحم صلّی اللہ علیہِ وسلم
سایۂ قد صدیقِ مکرم، صیدِ نظر فاروقِ معظّمؓ
رازِ نبوت کے دو محرم صلّی اللہ علیہِ وسلم
دونوں مظہرِ شانِ رسالت، دونوں پیکرِ صدق و عدالت
دونوں بامِ شرف کے سُلّم صلّی اللہ علیہ وسلم
ختم رسالت شاہِ زمنؐ پر، ختمِ خلافت ذاتِ حسنؓ پر
دونوں مصحفِ حق کے خاتم صلّی اللہ علیہ وسلم
سعدؓ و سعیدؓ و زبیرؓ و طلحہؓ، ابن عوفؓ اور ابو عبیدہؓ
گل کدۂ دیں جن سے ہے خُرّم صلّی اللہ علیہ وسلم
زیدؓ و بلالؓ و صہیبؓ وسلماںؓ، سب رفقاء انصار اوراعواں
رحمتِ باری سب پر پیہم صلّی اللہ علیہِ وسلم

اس نعت کا واقعہ یہ ہے کہ اقبال سہیلؔ نے یہ نعت اپنی بچی کو اپنے آبائی گاؤں 'بَرہرہ' کی زنانہ محفلِ میلاد میں پڑھنے کے لیے لکھی تھی۔اس نعت کے سلسلے میں دستیاب مولانا اسلمؔ جیراج پوری کے خط کا جواب دیتے ہوئے سہیلؔ لکھتے ہیں:

> گرامی نامہ موجبِ سرفرازی ہوا۔ ''موجِ کوثر'' کے متعلق آپ جیسے بزرگوں اور اربابِ نظر کے کلماتِ تحسین اور مخلصانہ ہمت افزائی میرے لیے یقیناً ایک غیر مترقبہ نعمت ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ میں نے زندگی بھر شعر کہے اور کبھی اشاعت کی پروانہ کی، بلکہ دوسروں کی محنت سے جمع شدہ سرمایہ کو بھی ضائع کر دیا، لیکن یہ نظم، جو محض اپنی بچی کو ''برھرہؔ'' کی زنانہ محفلِ میلاد میں پڑھنے کے لئے لکھ دی تھی اور عبد الرؤفؔ سلّمہٗ مالک ''سودیشی دکان'' کے اصرار پر چھپوادی، اس درجہ مقبول ہوئی کہ اب خیال ہوتا ہے کہ کم سے کم نعت ومنقبت کا مجموعہ تو چھپوادوں[۳]۔

اب اس شاعر کے تخیل، تصور اور فکر کی بالیدگی کا اندازہ کیجیے کہ جو شاعر اپنی بیٹی کے لیے اس نوع کی نعت گھر میں پڑھنے کے لیے کہتا ہو تو اس کا معیارِ شاعری کیا ہوگا؟

---

[۳] کلیات سہیلؔ، ص: ۲۲

آیئے اب ذرا اس نعت کی تکنیک اور خوبیوں پر بھی غور کرتے چلیں۔ سب سے پہلی بات جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کی ردیف ہے یعنی "صلّی اللہ علیہ وسلم"۔ جب کوئی شاعر اپنے قصیدے یا کسی شعری تخلیق کے لیے کوئی خاص قافیہ اور ردیف اختیار کرتا ہے تو ایک طرح سے وہ اپنے اوپر ایک پابندی عائد کرتا ہے، جس کا نباہ اسے بہ حسن وخوبی اور ہر حال میں کرنا پڑتا ہے ورنہ قافیہ تنگ ہونے والی بات ہو جائے گی۔ اقبال سہیلؔ نے ﷺ کی ردیف اختیار کر کے اپنے آپ کو کچھ خاص چیزوں کا پابند کیا اور اسے اِس طرح سے نباہا کہ آج کا قاری پڑھتے ہوئے مسحور ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی ردیف کے شایانِ شان مصرع لگانا اور اس کے مرتبے کو نبھانا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن سہیل نے اپنے مطالعے، حضور پاک کے اوصاف، اسلامی تاریخ اور حدیث سے واقفیت کے ساتھ ساتھ اپنی طبعِ رسا کا جوہر دکھاتے ہوئے اس منزل کو کامیابی کے ساتھ سر کیا۔ ان کے نعتیہ کلام کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے ان کا تفصیلی مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ سہیلؔ کے نعتیہ کلام کی خصوصیات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مرزا احسان بیگ نے لکھا ہے:

> نعت دراصل نہایت نازک مرحلہ ہے، جہاں ہوش و بصیرت سے کام نہ لیا جائے تو ہر قدم پر لغزش کا امکان ہے، اس لیے ہر راہرَو اس مقدس راہ سے کامیاب نہیں گذر سکتا، یہ کوئی دنیا کا عرصۂ رزم نہیں ہے کہ قدم پس و پیش کو نظر انداز کر کے بلا کسی غور و احتیاط کے گرد و غبار اڑاتا بڑھتا چلا جائے[۴]۔

اقبال سہیلؔ کے نعتیہ قصائد کی لفظیات، خیالات کی بلندی، واقعات کا تسلسل، حضورِ پاکؐ کی شخصیت کے اوصاف اور اظہارِ بیان اردو شاعری میں اپنی ایک منفرد شناخت اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ بیسویں صدی میں جب کہ قصیدے کی محفل ختم ہو گئی، اور یہ سمجھا جانے لگا کہ اب وہ وقت نہیں رہا کہ قصیدے کی صنف پروان چڑھ سکے، سہیلؔ نے نعتیہ قصائد کہہ کر یہ ثابت کر دیا کہ شاعر اگر موزوں طبع ہو تو اس کا ذہن کسی بھی موضوع اور صنف میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔

سہیلؔ نے بیسویں صدی میں نعتیہ قصائد کہہ کر قصائد کے لیے نئی راہیں پیدا کیں اور خود اس راہ سے کامیاب گزرے۔ ان کے نعتیہ قصائد پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غزل اور نظم کے میدان میں سہیلؔ کے مدمقابل شعرا ہو سکتے ہیں لیکن بیسویں صدی کی نعتیہ شاعری میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ انھوں

---

[۴]۔ ارمغانِ حرم، ص ۵۶

نے امراء کی مدح سرائی میں عمر نہیں گنوائی بلکہ حضور پاک صلعم اور تاریخ اسلام کے عظیم افراد کی شان میں قصائد کہے تاکہ دلوں میں اعلیٰ انسانی قدروں کا احترام پیدا ہو سکے۔ سہیل شاعری میں اخلاق سے فروتر بات کے قائل نہیں تھے، اس لیے انہوں نے قصیدہ نگاری کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے اصلاحِ قوم او ر درسِ اخلاق کا ذریعہ بنایا۔ آپؐ کی سیرت پاک وصحابہ کرام کے فضائل و محاسن اور تاریخ اسلام کے اہم واقعات کو اپنے قصائد کے ذریعے اُجاگر کیا۔

ادب کا مورخ آئندہ جب اردو کے نعتیہ قصائد کی تاریخ لکھے گا تو اس کا قلم اقبال سہیل کے نام نامی کو بیسویں صدی کے نعتیہ قصائد کا اہم شاعر لکھنے پر مجبور ہو گا۔ ان کے نعتیہ قصائد جن خصوصیات کے حامل ہیں، ان میں ان کا تخیل، تفکر، اسلامی تاریخ کے اہم واقعات، حضور پاک صلعم کی ذات وصفات، اسوۂ حسنہ کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدینؓ کا ذکر اور الفاظ کی بندش، صنعتوں کا بہترین استعمال شامل ہے۔

کتابیات:

۱۔ ارمغانِ حرم از اقبال سہیل، مرتب: افتخار اعظمی، مرکزِ ادب، جہانگیر آباد پیلس، لکھنؤ ۱۹۶۰ء

۲۔ کلیاتِ سہیل از اقبال سہیل، مرتب: عارف رفیع، بھاوے پرائیویٹ لمیٹڈ بمبئی ۱۹۸۸ء

سید صباح الدین عبدالرحمن اور شذرات نگاری

محمد فرحت حسین

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، بی آر اے بہار یونیورسٹی، مظفر پور

mdfarhat1994@gmail.com

کسی بھی روزنامے اور رسالے کے لئے اداریہ لازمی وضروری ہے۔ اداریے کے بغیر کسی روزنامے یا رسالے کا وجود نامکمل اور ادھورا ہے۔ اداریے کو چہرے سے تعبیر دی جاتی ہے یعنی جس طرح کسی آدمی کے چہرے کو دیکھ کر اس آدمی کے تئیں ایک تاثر قائم ہوتا ہے اسی طرح کسی اخبار، روزنامے یا رسالے کے لئے اداریہ اس اخبار کے لئے چہرے کی حیثیت رکھتا ہے جس کو پڑھ کر اس اخبار یا رسالے کی نوعیت، اس کی کمیت و کیفیت، معیار وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔ جتنا عمدہ اور بلند معیار کا اداریہ ہوگا اتنا ہی بلند معیار کا رسالہ سمجھا جائے گا: ''اداریہ اخبار کی جان ہے اس سے اخبار کے کردار کا تعین ہوتا ہے جو حالات حاضرہ پر اخبار کی اپنی رائے اور پالیسی کا اظہار کرتا ہے''۔[1] بہر حال اداریے کی اہمیت ولازمیت سے انکار ممکن نہیں۔

اداریہ کسی اخبار اور رسالے کے ایڈیٹر کی اپنی بات اور اپنی رائے ہوتی ہے۔ جس کی حیثیت نہ مضمون کی ہوتی ہے نہ افسانہ کی بلکہ وہ آزادانہ اظہار رائے ہے جس کا تعلق عصری میلانات ورجحانات، ملک وبیرون ملک کے سیاسی وسماجی مسائل سے ہوتا ہے یا فن وادب سے جس میں مدیر بڑی خوبصورتی ودلکشی پیرائے میں اپنا مطمح نظر واضح کرتا ہے یا اخبار ورسالے کی اپنی رائے اور پالیسی کا اظہار کرتا ہے۔ دراصل یہی ایک کالم ہے جس کے ذریعے عام قارئین کو اخبار یا رسالے کی پالیسی، اس کے نظریہ اور اس کے علاوہ بہت سی معلومات سے باخبر کیا جاتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ مدیر کو محتاط رویے اور دوراندیشی سے کام لینا پڑتا ہے:

> ایڈیٹوریل کا مقصد کسی خاص اور اہم موضوع پر اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کے علاوہ عام قارئین کو بہت کچھ بتانا سمجھانا، معلومات میں اضافہ کرنا اور اپنا ہم خیال بنانا ہونا چاہئے۔[2]

۱۔ سید ضیاء اللہ، اردو صحافت: ترجمہ وادارت، کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور، ۱۹۹۴ء، ص ۳۰۰

۲۔ احمد ابراہیم علوی، اردو صحافت کا جائزہ، مطبع کوالٹی پروسیس، لکھنؤ، ۲۰۰۰ء، ص ۴۲

اداریہ نہ اتنا مختصر ہو کہ اپنا نظریہ ہی واضح نہ ہو پائے بلکہ اور بھی گنجلک ہو جائے، نہ اتنا طویل ہو کہ غیر ضروری اشیاء شامل ہو جائیں اور اصل مقصد ہی فوت ہو جائے بلکہ اتنی ہی عبارت لکھیں جن سے اپنا مطمح نظر واضح ہو جائے۔

الفاظ کا انتخاب بڑے غور و فکر اور تلاش و جستجو کے بعد ہو، جملے و فقرے چست اور خوبصورت ہوں، زبان سلیس اور روزمرّہ کے مطابق ہو۔ جذبات کے رو میں نہ بہہ کر بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنا نظریہ و خیال پیش کرنا چاہئے جس میں کوئی رعب و دبدبہ نہ ہو بلکہ دلائل سے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش ہونی چاہئے۔

اداریے کبھی اپنی باتیں، اہم باتیں، ہماری باتیں، اداریہ، اداریے جیسی سرخیوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں تو کبھی بلیغ لفظ کے استعمال کے ساتھ جیسے معروف رسالہ ''نگار'' (۱۹۲۲) کے اداریے کی سرخی ''ملاحظات'' یا ''نیرنگ خیال'' لاہور (۱۹۲۴) کے اداریے کی سرخی، شذرات یا ماہنامہ ''برہان'' دہلی کے ''نظریات''، یا پھر معارف اعظم گڑھ کے ''شذرات''۔

اردو میں شذرات کے معنی ہیں منتشر، بکھرا ہوا، پراگندہ، اداریہ، ادارتی نوٹ اور یہ شذرہ کی جمع ہے لیکن عربی میں شذرہ خالص سونے کے دمکتے ہوئے ٹکڑے یا سمندر کی تہہ سے نکلنے والے موتیوں کے دانے دونوں کو کہتے ہیں۔

معارف اعظم گڑھ کے اداریے کے لئے لفظ ''شذرات'' کا استعمال علامہ سید سلیمان ندوی نے کیا تھا۔ قیاس یہی ہے کہ سب سے پہلے اداریہ کے لئے لفظ شذرات کو علامہ سید سلیمان ندوی نے رسالہ 'الندوہ' میں استعمال کیا تھا اور جب الندوہ ۱۹۱۵ء میں بند ہوا اور ۱۹۱۶ء میں معارف اعظم گڑھ کا اجرا عمل میں آیا تو علامہ صاحب نے اسی لفظ شذرات کو معارف کے اداریہ کے لئے منتخب کر لیا۔ اس طرح یہ ان کے اولیات میں شمار ہوتا ہے اور اس طرح کے بلیغ لفظ کا استعمال اداریے کے لئے علامہ صاحب کا ہی خاصہ ہو سکتا تھا۔ پھر اس کے بعد تو اداریے کے لئے اس طرح کی سرخیاں عام ہو گئیں۔

جن رسالوں کے اداریے فنی ادب پارہ یا فنی شاہکار کے طور پر تسلیم کئے گئے ان میں سے ایک ''معارف'' اعظم گڑھ بھی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ معارف کے مقالات بعد میں پڑھے جاتے ہیں اور اداریہ پہلے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ اس کے اداریے پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ لوگ اس کا بے صبری سے انتظار کرتے ہیں اور یہ ایک عمدہ اداریے کی پہچان ہے۔

معارف کا اداریہ دوسرے رسالوں کے اداریے سے الگ، انوکھا اور ایک شان لئے ہوئے ہوتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے معیار کو کسی زمانے میں گرنے نہیں دیا گیا بلکہ علامہ صاحب سے جو روایت

چلی اس کو ہر مدیر موصوف نے برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ یہی نہیں معارف اعظم گڑھ کی تاریخ میں ایک ایسا بھی مدیر رہا ہے جس نے اس کو ایک نئی سمت ورفتار اور الگ پہچان دینے کی کوشش کی۔ وہ تھے سید صباح الدین عبدالرحمن۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "شذرہ نگاری" اب اردو صحافت میں مستقل حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ لیکن جن خصوصیات کی بنا پر مختلف علمی، ادبی، فکری اور قومی مسائل پر مختصر اداراتی نوٹ "شذرات" کی حیثیت اختیار کرتے ہیں، ان کا علمی نمونہ علامہ سید سلیمان ندوی نے "معارف" کے ذریعہ پیش کیا۔ وہ ایسے اسلوب نگارش پر قدرت بھی رکھتے تھے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کے بعد بھی یہ خصوصیت برقرار رہی ، لیکن جس آب وتاب کے ساتھ اس قالب میں سید صباح الدین عبدالرحمن نے اپنی انفرادیت کی روح پھونکی وہ اپنی مثال آپ ہے۔[۳]

صوبہ بہار کے مشہور پرگنہ بہار شریف سے شمال مشرق میں تقریباً آٹھ میل دور جرائن ندی کے کنارے واقع ایک مردم خیز بستی "دیسنہ" ہے۔ ملک کی آزادی تک اس گاؤں نے اپنی زرخیزی وشادابی کی وجہ سے اپنے دامن میں وہ شہرت، عظمت اور عزت حاصل کرلی تھی جو اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے مقابل کوئی دوسرا ایسا علاقہ نہیں تھا جس کی عظمت وعزت اتنی ہو جتنی اس گاؤں کی تھی۔ اس کی پذیرائی وشہرت کا یہ عالم تھا کہ اس وقت کے بڑے بڑے سیاست داں، حکما، فضلا نے اس گاؤں کا دورہ کیا۔ ان میں سرفہرست ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں جو پہلے بہار کے گورنر تھے بعد میں صدر بنے، بابو راجندر پرساد جو آزاد ہندستان کے پہلے صدر بنے۔ ان کے علاوہ کئی اور نامور ہستیاں شہرت سے متاثر ہو کر گاؤں کا دورہ کیا جو دیسنہ کی عظمت ورفعت پر شاہد ہے۔

یہاں مشرقی ومغربی تعلیم کا چرچہ شروع سے عام رہا۔ مشرقی تعلیم کی بنا پر انسان دوستی، قناعت پسندی، سادگی، وضعداری، سچائی سے یہاں کے لوگوں نے جہاں دوسروں پر گہرا اثر چھوڑا، وہیں مغربی تعلیم سے معتبر ڈاکٹر، محترم استاد، لائق انجینئر وسائنسداں بنے۔ اس کی زرخیزی وشادابی کی وجہ سے یہاں بہت سے صاحب کمال پیدا ہوئے جنھوں نے فطری اور خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر جہاں قوم وملت کا بھلا کیا وہیں اپنے علاقے اور ملک کا نام روشن کیا۔ یہاں کے صاحب فضل وکمال جہاں گئے اپنے علم وفضل سے تاریک راہوں کو منور کیا، بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھائی، تعلیمی لیاقت وصلاحیت کی بنیاد پر اپنا سکّہ جمایا۔

۳۔ حکیم محمد سعید، سہ ماہی "فکر ونظر"، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۶۷

علامہ سید سلیمان ندوی، پروفیسر سید نجیب اشرف، ظفر احمد ندوی، سید شہاب الدین، پروفیسر سعید رضا، عبدالقوی دسنوی وغیر ہم جیسے باکمال دیسنہ کی زینت تھے۔ یہ سب دیسنہ کے افق پر مثل کواکب و نجوم کے تھے جن میں علامہ سید سلیمان ندوی کی حیثیت بڑے ستارے کی تھی۔

انھیں ستاروں میں سید صباح الدین عبدالرحمن بھی تھے جو دیسنہ کے افق پر ۱۹۱۱ء میں طلوع ہوئے۔ شکم مادر میں ہی تھے کہ پدر محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور جب سات سال کی عمر ہوئی تو ماں بھی داغ مفارقت دے کر چلی گئی لیکن چونکہ نانیہال بھی گاؤں میں ہی تھا اور دونوں طرف یعنی نانیہال اور دادیہال جدید و قدیم تعلیم یافتہ اور باوقار، مؤثر خاندان تھے لہٰذا انھوں نے بڑے لاڈ پیار اور ناز و نعم سے ان کی پرورش کی اور کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی جس سے سید صباح الدین کو والدین کی کمی کا احساس نہیں ہوا۔

گاؤں کے مدرسے میں ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر وہاں سے نکل کر پٹنہ، نالندہ، مظفر پور، علی گڑھ جیسے بڑے علمی شہروں میں تعلیم حاصل کر کے اپنے آپ کو زیور علم سے آراستہ کیا۔ لیکن اب تک علم کی پیاس بجھی نہ تھی اس لئے اپنے استاد علامہ سید سلیمان ندوی کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ۱۹۳۵ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ چلے آئے۔ تب سے جو رشتہ قائم ہوا وہ بعد مرگ ہی ختم ہوا۔ اس طرح ان کو نصف صدی سے زیادہ علم و فن کے گیسو سنوارنے اور ان کی آبیاری کا موقع ملا۔ اور اس طویل عرصے میں انھوں نے بڑی مستعدی و جانفشانی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ اپنی صلاحیت و لیاقت اور گلشن شبلی کی مہکتی ہوئی فضا، وہاں کی علمی و ادبی ماحول سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے متنوع موضوعات پر تصنیفات و تالیفات کا ایک وسیع ذخیرہ بطور یادگار چھوڑا۔

ان کو تصنیف و تالیف کا ملکہ حاصل تھا۔ جب چاہتے لکھتے انھیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ سفر میں ہیں یا حضر میں۔ ان کی تخلیقات کمیت و کیفیت دونوں حیثیت سے دارالمصنفین کے دیگر مصنفین کی طرح معیاری ہیں۔ حالانکہ ان کا خاص موضوع ہندستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ تھا لیکن ان کا قلم شعر و ادب، تحقیق و تنقید، سوانح نگاری، خاکہ نگاری اور انشاپردازی پر بھی رواں دواں رہا۔ تصوّف جیسے موضوع پر بھی انھوں نے اپنی علمی لیاقت و مزاج و منہاج سے ایک الگ رنگ پیدا کیا جس میں ادبی شان بھی ہے اور ذوق تسکین کا سامان بھی۔

سید صباح الدین عبدالرحمن کی شخصیت گونا گوں صفات کی حامل اور کثیر الجہات تھی۔ وہ ایک عظیم مورخ کے ساتھ ساتھ عظیم فن کار و ادیب، محقق، انشاء پرداز اور بلند پایہ کے صحافی بھی تھے۔

انھوں نے رسالہ ''معارف''، میں شذرات لکھنا منصب نظامت پر فائز ہونے سے قبل ہی شروع کر دیا

تھا، لیکن ایسے شذرات کی تعداد کم ہے کیونکہ ناظم دارالمصنفین شاہ معین الدین احمد ندوی جب سفر پر ہوتے یا علیل ہوتے تو سید صباح الدین عبدالرحمن شذرات لکھتے اور یہ بھی سید صباح الدین عبدالرحمن کی علمی لیاقت وصلاحیت پر دال ہے کہ اتنے موقر رسالے کا اداریہ ناظم دارالمصنفین ان سے لکھواتے۔

سنہ ۱۹۷۵ میں ناظم دارالمصنفین بننے کے بعد آخر حیات تک وہی شذرات لکھتے رہے، اس طویل عرصے میں انہوں نے مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا، ان میں علمی وادبی، سیاسی، سماجی، قومی وملی، تہذیبی وتمدنی یا پھر مذہبی ہر طرح کے موضوعات ان کے زیر بحث آئے اور بڑی دلکشی، خوش سلیقگی اور حسن ترتیب کے ساتھ پیش کیا۔

انھوں نے موضوعات کی رنگارنگی اور اس کے تنوع سے نہ صرف یہ کہ رسالہ 'معارف' کے علمی وقار اور روایت کو برقرار رکھا بلکہ اس میں ایک گونا گوں تقویت پہنچائی اس کے حسن کو دوبالا کیا اور خوبصورتی میں اضافہ بھی۔

شذرات سید صباح الدین عبدالرحمن کو جو کہ ان کے شذرات کا مجموعہ ہے، اس کو ڈاکٹر مہ جبیں زیدی نے ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل، سید صباح الدین عبدالرحمن کی شذرات نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> معارف کے شذرات کی روایت تو دراصل مولانا سید سلیمان ندوی ہی کے زمانے میں نمایاں ہو چکی تھی لیکن دراصل اپنے موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے اس روایت کو مزید نکھار سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے زمانہ ادارت میں حاصل ہوا، جو اس رسالے کی تاریخ کے طویل ترین دور پر محیط ہے۔ سید صاحب نے اپنے شذرات کو کسی خاص موضوع یا مطالب تک محدود نہیں رکھا۔ یہ بے حد متنوع اور ہمہ جہت موضوعات پر مشتمل ہوتے تھے۔[۴]

ان میں تاریخی وتہذیبی معاملات وموضوعات بھی ہیں جن کا تعلق عہد ماضی سے بھی ہے اور وہ ہم عصر حوالوں سے بھی زیر بحث آتے ہیں۔ یہی صورت ادبی، علمی، سیاسی اور قومی وملی موضوعات اور عنوانات کے بارے میں دیکھی جا سکتی ہے:

> ایسے جو عنوانات سید صاحب کو روز مرّہ حوالوں سے اپنی طرف متوجہ کرتے رہے، وہ بھی ان شذرات کا موضوع بنتے رہے اور وہ موضوعات بھی ان کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہے ہیں، جو

۴۔ ڈاکٹر مہ جبیں زیدی، ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ (شذرات صباح الدین عبدالرحمن)، منزل اکیڈمی، کراچی ۲۰۰۶ء، ص ۲

دوران مطالعہ یا تحقیق کے ذیل میں انھیں قابل ذکر نظر آئے اور سید صاحب نے انھیں اپنے نظریے، اپنے خیالات یا اپنے مطالعے و تجزیے کے ساتھ اپنے قارئین کے ملاحظے میں لانا پسند کیا۔اس طرح ان کے شذرات فی الحقیقت اپنے تنوع، اپنی رنگارنگی اور اپنے مطالعے و تجزیے کے لحاظ سے اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ چنانچہ ان کا مطالعہ دراصل ایک جہان فکر و معنی کا مطالعہ ہے، جو نہایت اختصار بلکہ چند ہی سطروں میں اپنے قاری کو بہت کچھ دے جاتا ہے۔[5]

سید صباح الدین عبد الرحمن ایک بے باک اور نڈر صاحب قلم تھے۔انہوں نے وہی لکھا جو ضمیر کی پکار تھی، ضمیر کا سودا کبھی نہیں کیا۔ وہ موضوعات بھی ان کے زیر قلم آئے جن کو دوسروں نے چھونے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے کبھی بھی مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا بلکہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہا۔

سید صباح الدین کے شذرات کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو ایک ہی طرح کے موضوعات تک محدود نہیں رکھا بلکہ تمام طرح کے موضوعات کو اپنے شذرات میں جگہ دی اور اس رنگارنگی اور تنوع کی وجہ سے شذرات کی روایت میں ایک الگ شان پیدا ہو گئی۔

اردو زبان کے وجود و بقا کی جب بھی بحث چھڑی تو ان کا اشہب قلم اس طرح حرکت میں آیا کہ کئی شمارے میں اس بحث کو اپنے زاویہ نگاہ سے تنقید و تجزیہ کے ساتھ پیش کیا اور حکمراں، سیاسی جماعت یا دوسروں پر الزام تراشی سے زیادہ اپنے لوگوں سے ماتم کناں رہے۔ چنانچہ رسالہ 'معارف' شمارہ مارچ ۱۹۷۵ء میں سید صباح الدین عبد الرحمن رقمطراز ہیں:

دارالمصنفین کے مہمان خانے میں لکھنؤ کے رہنے والے ایک مسلمان سرکاری عہدیدار ٹھہرے تو انھوں نے اثنائے گفتگو میں بیان کیا کہ ان کا لڑکا اچھی غزل کہتا ہے مگر اس کو ہندی رسم الخط میں قلم بند کرتا ہے کیونکہ وہ اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے[6]

اس کے فوراً بعد وہ دو الگ الگ واقعے کا ذکر کرتے ہیں جن سے مسلمانوں کی اردو کے تئیں غفلت شعاری اور عدم توجہی صاف جھلکتی ہے۔اس کے بعد وہ جس نتیجے تک پہنچتے ہیں وہ پڑھنے سے تعلق

۵۔ حوالہ سابق

۶۔ رسالہ معارف، شمارہ مارچ ۱۹۷۵ء، ص ۱۶۲

ہے وہ آگے اسی شمارے میں لکھتے ہیں:

اگر کوئی قوم یا فرقہ یا نسل اپنی مادری زبان کھو بیٹھتی ہے تو وہ جیتے جی ہلاک ہو جاتی ہے۔ اردو بولنے والے طلبہ کے لئے اپنی مادری زبان نہ پڑھنا اور اس کے پڑھانے کی سہولتیں فراہم نہ کرنا نسل کشی ہے۔ جو طلبہ اردو اس لئے نہیں پڑھتے کہ سرکاری ملازمتوں میں یہ کام نہیں آتی، اگر زندگی کا مقصد صرف پیٹ پالنا ہو تو مادری زبان چھوڑی جاسکتی ہے۔ پھر اس پیٹ کی خاطر دین بھی چھوڑنے میں تامل نہ ہوگا جس کے بعد تہذیبی، ملی اور مذہبی روایات کا وارث بن کر زندہ رہنے کا حق نہیں رہتا۔[۷]

اسی طرح اردو۔ ہندی کا قضیہ ہو یا اردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کا مسئلہ، انھوں نے اپنی آزادانہ رائے رکھی اور کھل کر اس پر بحث کی، نہ کسی سے مرعوب ہوئے نہ کسی کے سامنے سرخم کیا بلکہ اپنی بات دلائل و براہین کی روشنی میں رکھی اور پرزور طریقے سے رکھی۔ دوسروں سے زیادہ امید وفا رکھنے کے بجائے اپنے لوگوں کو اس بات کا احساس دلاتے رہے کہ اگر ہم اپنی سطح پر اُردو کے وجود و بقا اور اس کی ترویج و اشاعت میں کوشاں نہیں رہیں گے تو ہم ہی اپنے ہاتھوں سے اپنے اسلاف کی وراثت کو ختم کر دیں گے۔

سید صباح الدین عبدالرحمن نے کسی خاص موضوع تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ تمام طرح کے موضوعات کو جگہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ جب مذہبی سطح پر انتشار، بکھراؤ اور فرقہ بندی سے امت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور اس کے سبب خستہ حالی، پریشانی اور تنزلی اس امت کو نصیب ہو رہی تھی تب اس کا بغور مطالعہ ومشاہدہ کے بعد وہ چپ نہ رہ سکے۔ جنوری ۱۹۸۰ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:

مسلمان اسلام میں داخل ہوئے تو جب تک ان کے دلوں میں ایمان داخل رہا، یا جب تک انھوں نے قرآن حکیم کو اپنے سینوں سے لگائے رکھا، یا جب تک کعبہ کو اپنی جبینوں سے بسایا تو وہ دنیا کے لئے خیر و برکت بنے رہے، وہ حق وصداقت کی خاطر کبھی خشکیوں اور کبھی دریاؤں میں لڑے، جنگ میں لڑے تو کبھی نہیں ٹلے، کبھی یورپ کے کلیساؤں اور کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اذانیں دیں، دلوں پر نقش توحید بٹھانے کی خاطر در خیبر اکھاڑا، شہر قیصر کو سر کیا، آتشکدۂ ایران کو ٹھنڈا کیا، دشت تو دشت کوہ اور سمندر بھی نہ چھوڑا۔ اُن کے عروج کی داستان اگر شاندار ہے تو ان کی تاریخ ان کے زوال کے اسباب سے بھی داغدار ہے۔ ان کی مذہبی فرقہ بندی کی

۷۔ حوالہ سابق ص ۱۶۲

کہانی ان کے سیاسی انتشار سے زیادہ المناک ہے۔[۸]

پھر انھوں نے ۴۶ سے زیادہ فرقوں کے بارے میں اختصار مگر نہایت ہی جامعیت کے ساتھ لکھا ہے کہ کون سا فرقہ کب وجود میں آیا اور کس طرح، اس کا پس منظر کیا تھا اس کے بانی و موجد کون تھے، ان کے عقائد کیا ہیں:

اس سے ان کے معلومات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ سید صباح الدین عبدالرحمن صرف تاریخ کے میدان کے شہسوار نہیں تھے بلکہ وہ مذہبی امور کے بھی ایک بڑے عالم اور جانکار تھے۔ اور اخیر میں اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ ''چودہ سو سال کے بعد مسلمان اپنی فرقہ بندی کے المیہ پر خون کے آنسو بہائیں، اور سوچیں کے ان کے لئے زمانے میں پنپنے کی باتیں کون سی ہیں''۔[۹]

سید صباح الدین عبدالرحمن کو الفاظ پر مکمل عبور اور دسترس حاصل تھی۔ وہ الفاظ کی سحر کاری سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے شگفتہ الفاظ کا استعمال جابجا کیا ہے جس سے غنائیت اور نغمگی پیدا ہوتی ہے۔ ان کی تراکیب عمدہ لیکن کہیں کہیں رعایت لفظی کے چکر میں ثقیل اور بوجھل بھی۔ ان کا انداز بیان نہایت ہی سلیس، واضح اور صاف ستھرا ہے جس میں ایک طرح کی دلکشی اور رعنائی بھی شامل ہے۔

وہ نہایت ہی چست فقرے استعمال کرتے، عربی و فارسی کے تراکیب دھڑلے سے استعمال کرتے۔ بعض دفعہ تو عربی، فارسی یا اُردو کے شعر کی ایسی ترجمانی کرتے ہیں جس سے ان کی نثر میں نظم کی چاشنی آجاتی۔ مثال کے طور پر جنوری ۱۹۸۰ء کے شمارے کی یہ عبارت دیکھیں جس میں شاعر مشرق محمد اقبال کی مشہور زمانہ نظم ''شکوہ'' کے کئی مصرعے کی ترجمانی کی ہے۔ پہلے صباح الدین عبدالرحمن کی عبارت ملاحظہ ہو:

وہ حق و صداقت کی خاطر کبھی خشکیوں اور کبھی دریاؤں میں لڑے، جنگ میں لڑے تو کبھی نہیں ٹلے، کبھی یورپ کے کلیساؤں اور کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اذانیں دیں، دلوں پر نقش توحید بٹھانے کی خاطر در خیبر اکھاڑا، شہر قیصر کو سر کیا، آتشکدۂ ایران کو ٹھنڈا کیا، دشت تو دشت کوہ اور سمندر بھی نہ چھوڑا۔

۸۔ رسالہ معارف، شمارہ جنوری ۱۹۸۰ء، ص ۲

۹۔ حوالہ سابق ص ۸

اب ملاحظہ ہو نظم کے چند مصرعے:

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں!
خشکیوں میں کبھی لڑتے، کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
ٹل نہ سکتے تھے ، اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اُکھڑ جاتے تھے
تو ہی کہہ دے کہ اُکھاڑا درِ خیبر کس نے؟
شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟
دشت تو دشت ہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے[۱۰]

یہ سید صباح الدین عبدالرحمن کی خصوصیت وانفرادیت تھی کہ اپنی عمدہ نثر نگاری میں نظم نگاری کی چاشنی ومٹھاس گھول دیتے تھے۔

اب ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو اور دیکھئے کہ کس طرح خوبصورت الفاظ سے سحر کاری کا کام لیتے ہیں اور کس طرح خوبصورت الفاظ کا ہالہ تیار کر کے ایک خوبصورت، حسین رنگارنگ مرقع یا ہار بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس کی لڑی میں حسین الفاظ مثل موتی کے دانے کے جڑے ہیں۔

مئی ۱۹۸۵ء کے شمارے میں سید صباح الدین رقمطراز ہیں:

مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری ملک کی اور یونیورسٹیوں کی وائس چانسلری سے بالکل مختلف ہے۔ یہ آٹھ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی تمناؤں کی مرغزار، ان کی آرزوؤں کا گلزار اور ان کی خواہشوں کا سبزہ زار ہے۔ پھر انہی مسلمانوں کی اولاد کے جذبات کا خم کدہ ہے، ان کے احساسات کا گل کدہ ہے اور ان کے تخیلات کا عشرت کدہ ہے۔ اس رنگارنگی کے ساتھ اس کو سرسبز اور شاداب رکھنا آسان نہیں۔[۱۱]

۱۰۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۸ء، ص ۱۶۴۔۱۶۶

۱۱۔ رسالہ معارف، شمارہ مئی ۱۹۸۵ء، ص ۳۲۲

سید صباح الدین عبدالرحمن کا عالی اور پر مغز دماغ کتنا متحرک اور فعال تھا، ان کا مطالعہ کتنا عمیق اور گہرا تھا، ان کے پاس معلومات کا کتنا خزانہ تھا، یہ ان کے شذرات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے۔ ان کی تحریر میں روانی ہوتی تھی۔ ان کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت اور انفرادیت یہ ہے کہ محبت، اخوت و ہمدردی و بھائی چارگی، ایکتا اور اتحاد کا پیغام جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔

قومی یکجہتی اور ملک کی سالمیت، وطن دوستی اور اپنے وطن سے وفا شعاری کی بھینی بھینی اور سوندھی سوندھی خوشبو اور معطر کرنے والی فضا ان کی تحریروں کے نمایاں اوصاف ہیں جس سے ان کی وطن سے انسیت اور محبت کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ وطن سے کتنی محبت کرتے تھے۔ گنگا جمنی تہذیب کے نہ صرف یہ کہ بڑے حامی تھے بلکہ اپنی تحریروں سے صدیوں پرانی روایت کو فروغ دیتے رہے اور بھائی چارگی کے ترانے گاتے رہے۔ اور یہ انداز بیان و اسلوب ان کا اپنا ہے جس میں خلوص اور قطعیت ہے۔ تصنع اور بناوٹ دور دور تک نہیں۔ اور بقول ڈاکٹر خورشید عالم کے:

> صباح الدین عبدالرحمن کے شذرات میں سید صاحب اور شاہ صاحب کی متانت و سنجیدگی کا عکس بھی ہے اور علامہ شبلی کے قلم کی سحر طرازیوں اور اٹکھیلیوں کے جلوے بھی۔ ان کی شگفتہ تحریر و دلکش انداز بیان اپنے رنگا رنگ صہبائی اور گل اندامی جلوؤں کی کثرت سے انھیں انفرادیت کا تاج پہناتا ہے۔ جس میں مولانا محمد حسین کی انشاپردازی کے لعل و جواہر کی مرصع کاری بھی نظر آتی ہے۔[۱۲]

وہ ہمیشہ بے باک، نڈر اور مخلص اہل قلم کے طور پر یاد کئے جائیں گے۔

۱۲۔ ڈاکٹر خورشید عالم، صباح الدین عبدالرحمن: حیات اور کارنامے، احسان بک ڈپو، لکھنؤ، ۲۰۰۹ء، ص ۲۶۶

انجمن ترقی اردو ہند کرناٹک کا دو روزہ قومی سمینار

محمد عمیر الصدیق ندوی

۱۸۵۷ء کے بعد کے ہندوستان کے سیاسی و ثقافتی اور معاشرتی تغیرات پر نظر رکھنے اور پیش بندیوں کی فکر کرنے کی جو کارآمد اور دیرپا کوششیں ہوئیں ان میں ایک نمایاں کوشش بلکہ تحریک انجمن ترقی اردو کے نام سے شروع ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک شعبہ اور پھر ۱۹۱۰ء میں انجمن ترقی اردو کے نام سے ایک جدا اور مستقل وجود کی شکل اختیار کرنے کے بعد ایک نہایت قابل قدر و احترام فعال و متحرک اور زندہ و بیدار تنظیم کی حیثیت سے انجمن کی شناخت قائم ہوتی گئی۔ علامہ شبلی، پروفیسر آرنلڈ، مولانا حالی، مولانا شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی، بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسی شخصیتوں کی توجہات نے انجمن کو پوری اردو دنیا کی توجہ کا مرکز بنا دیا، ہمارے دور میں پروفیسر خلیق انجم، سید حامد اور اب اطہر فاروقی نے انجمن کے وقار کے ساتھ اس کی اہمیت و افادیت کے نقوش کو مٹنے نہ دیا۔

دارالمصنّفین نے شبلی اور اردو دونوں کے تعلق سے انجمن سے خود کو جدا نہیں سمجھا، معارف کے صفحات اس سچائی کے گواہ ہیں، سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے لکھا کہ دارالمصنّفین کو انجمن سے دیرینہ لگاؤ رہا ہے کیوں کہ اس کے ابتدائی روح رواں علامہ شبلی تھے، ان کے بعد یہاں کے لوگ کسی نہ کسی طرح ہر زمانہ میں اس سے وابستہ رہے، انجمن کی کوششوں کو برابر یہ کہہ کر تسلیم کیا گیا کہ سرمایہ کی کمی اور ناسازگار حالات کے باوجود اس کی کارکردگی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ ایک بار ڈاکٹر خلیق انجم انجمن کے جنرل سکریٹری کی تعریف یوں کی کہ انھوں نے اردو گھر بنوایا، شاہ جہاں کو دہلی کے لال قلعہ کی تعمیر میں شاید اتنی مشکلوں اور پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑا ہوگا جتنا ڈاکٹر خلیق انجم کو اردو گھر بنوانے میں پڑا ہوگا۔

صباح الدین صاحب سے پہلے شاہ معین الدین احمد ندوی نے بھی کئی بار انجمن اور اردو کو اپنے شذرات کا موضوع بنایا۔ ۱۹۶۱ء میں انجمن ترقی اردو کی ایک سالانہ کانفرنس کا افتتاح اس وقت کے یوپی کے گورنر ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ نے کیا اور وزیر اعلیٰ سی بی گپتا نے تقریر کی، دونوں نے اردو کے حقوق کا صریح اعتراف کیا اور جو حق تلفی ہوگئی اس کی تلافی کا وعدہ کیا تو معارف نے اچھی توقع قائم کی کہ شاید اردو کی کس مپرسی کا دور اب ختم ہو جائے۔

۱۹۸۸ء میں انجمن ترقی اردو کی صدارت کے لیے سید حامد صاحب کا نام آیا تو مولانا ضیاء الدین اصلاحی

نے لکھا کہ یہ انجمن اور اردو دانوں کے لیے فال نیک ہے، انہوں نے بھی اس توقع کا اظہار کیا کہ اب انجمن تحریک کا روپ اختیار کرنے والی ہے۔ اس کے جمود و تعطل کے ختم ہونے کے دن آ گئے ہیں۔

انجمن ترقی اردو ہند کے تعلق سے ماضی کا یہ سفر یوں یاد آیا کہ بنگلور سے کرناٹک کی انجمن کے ایک مذاکرہ علمی کی خبر ملی۔ ادھر عرصہ سے کورونا اور اس سے بھی پہلے ملک کی سیاست کے پیچ و خم میں دوسرے ملی اداروں کی زندگی جیسے ٹھہر سی گئی تھی۔ افراد کی طرح اداروں میں افسردگی، مایوسی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ایسے میں جنوب ہند میں انجمن کا نام اور اس کے مذاکرہ کا عنوان دونوں نے گویا چپکے سے بہار آنے کا پیغام سنا دیا۔ بنگلور یا تبدیل شدہ بنگلورو کو شہر گلستاں کہا جاتا ہے، وہاں کی فضاؤں کے اعتدال نے ہمیشہ وہاں کے موسم کے لیے خوشگوار اور سازگار جیسے صفاتی الفاظ خاص کر دیے۔ اعتدال کی صفت اگر معاشرہ میں ہے تو فکر و عمل میں بھی ان خوبیوں کا اثر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ سمینار کا موضوع بھی ذرا سوچ سمجھ کر منتخب کیا گیا، یعنی ''جنوبی ہند میں اردو کی ابتداء، ارتقا اور مسائل'' ماضی، حال اور مستقبل کے سلسلوں کی یہ پاسداری واقعی داد کے لائق ہے۔ موضوع نے سمینار کا انعقاد کرنے والوں کے ذوق کی بھی خبر دی، یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے انجمن ترقی اردو ہند کرناٹک کی ذمہ داری عرصہ سے اپنے ذمہ لے رکھی ہے، ان میں انجمن کے صوبائی صدر جناب محمد عبیداللہ شریف اور جنرل سکریٹری جناب مبین منور کے نام نظر آئے، ساتھ میں دارالمصنّفین اور معارف دونوں کے نہایت مخلص، قدرداں اور اپنی علمی فیاضیوں سے گراں بار کرنے والے ڈاکٹر راہی فدائی کی شمولیت سے ایک خوبصورت مثلث بھی تشکیل پا گیا۔

اگست کی چھ اور سات تاریخوں میں بنگلور کے ایک شاندار ہال میں اردو کے حال کے مشاہدہ کا وقت آیا تو مقالہ نگار حضرات اور ان سے بھی زیادہ قابل داد سامعین اور شرکائے محفل کی تعداد نے گویا انبساط اور نشاط روح کا سامان فراہم کر دیا۔ عام سمیناروں سے امتیاز کی نوعیتوں کو واضح کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ یہ علمی مجلس کچھ الگ سی کیوں ہے۔ جنوبی ہند میں اردو زبان و ادب پر خالص موضوعی ہونے کا پہلا مقصد تو اردو زبان کی صحیح تاریخ سے بہرہ ور ہونا تھا، اس لیے یہ اندیشہ غیر ضروری نہیں تھا کہ شخصیات یا پامال موضوعات کی جگہ ایک واقعی علمی و تاریخی مزاج و فکر کی موجودگی بظاہر سمینار کے بوجھل اور پھر ناکام ہونے اور نتیجہ میں دل شکستگی سے دوچار ہونے کا انجام سامنے نہ لے آئے، لیکن حوصلے ہوں اور مقصد کے تعین میں دور اندیشی اور بصیرت کی دولت ہو تو معلومات اور انکشافات اور رائج تصورات کی تحقیق اور تنقیح جیسے نتائج کا حصول امکان کی دسترس سے دور نہیں رہ سکتا۔

جنوبی ہند یاد کن ہمارے ملک کی شمالی و جنوبی سمتوں ہی کا پیمانہ نہیں، یہ برفانی سلسلہ کوہ سے بیکراں موج

در موج سمندروں تک ایک فرش قدرت کا حیران کن نظارہ ہے۔ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ کی تفسیر کا تو پورا عالم ہی شارح و ترجمان ہے لیکن میدانی اور کوہستانی حصوں کی تقسیم کا مطالعہ قدرت کی نیرنگیوں کا عجب اظہار و اعتراف ہے، مورخوں کی نظر میں دکنی ہندوستان کا باب اول برہان پور ہے، یہیں سے طلسم خانہ دکن کے سارے اسرار و رموز، وقت اور زمانہ کے روزنوں کو اجالے بخشتے جاتے ہیں۔

دکن میں اردو کا پہلا وجود اور پھر اس کے فروغ کا مطالعہ یوں ہی محققوں اور مورخوں کا موضوع نہیں بنا، مولانا سید سلیمان ندوی کی نظر سے دیکھا جائے تو یقین کے ساتھ اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ اردو کو شمال اور جنوب کی سمتوں سے دیکھنے والوں کے لیے یہ بات فکر انگیز ہے کہ شمالی ہندوستان اگر ہندوستان میں نئی آنے والی قوموں کا شارع عام رہا ہے تو جنوبی ہندوستان یا دکن بعد کو آنے والی قوموں کے لیے شکست کھا کر مجتمع ہونے کے لیے ملجا رہا ہے۔ ہر نئی حملہ آور قوم نے اگر شمالی ہندوستان سے اپنی پیش رو قوم کو دھکیلا ہے تو دکن ہی کی پہاڑیاں اس کے لیے جائے پناہ بنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ آج جنوبی ہندوستان، قدیم سے قدیم قوموں سے لے کر آخری دور جدید کی قوموں کا تماشا خانہ اور جلوہ گاہ ہے۔ معارف نے بہت پہلے یہ راز کھولا تھا کہ اردو کی مشترک زبان کی ضرورت سب سے پہلے دکن میں کیوں محسوس ہوئی۔

موجودہ دور میں اس ضرورت کا احساس اور اس کی یاد گویا اس سمینار کے ذمہ داروں کے دل کی آواز تھی۔ یہ آواز جس طرح بلند ہوئی۔ کرناٹک تو اس کا عینی شاہد بنا ہی، کہا جاسکتا ہے کہ شاید پورا ملک اس کا گواہ بن جائے، ولی دکنی اور سراج اور نگ آبادی نے کیا کبھی سوچا ہوگا کہ ایک نئی زبان کی نئی شاعری کی اولیت کا سہرا ان کے سر ہوگا۔

سمیناروں کے افتتاحی اجلاس میں عموماً کچھ ارباب سیاست و ثروت کی شرکت، حالات کے تقاضوں اور مفادات کے سبب ضروری سمجھی جاتی ہے۔ افتتاحی اجلاس میں مشہور سیاسی رہنما جناب کے رحمن خاں کے علاوہ مقامی ممبران اسمبلی جناب رضوان ارشد اور اکھنڈ اسری نواس مورتھی موجود تھے، لیکن ان رہنماؤں نے جس طرح فصیح و بلیغ اردو میں اردو کی تاریخ اور زبان کے مسائل اور موجودہ مشکلات پر اظہار خیال کیا وہ محض ان کی زبان دانی ہی نہیں ان کی عملی جدوجہد کی ایسی تصویر تھی جو کم از کم شمالی ہند کے سیاسی رہنماؤں میں شاذ ہی نظر آتی ہے۔ کے رحمن خاں صاحب تو سیاسی مفکر کہلاتے ہی ہیں، شیواجی نگر یا کبھی معسکر کے نام سے بنگلور کے ایک علاقہ کے ایم ایل اے رضوان ارشد نے جس طرح بنگلور کے بعض قدیم مدارس اردو کو نئی زندگی دی ہے اور کروروں روپے کی سرکاری امداد سے ان اردو اسکولوں کو معیاری اور جدید ترین سہولتوں سے آراستہ مرکز بنانے کی سعی کی ہے اس کی داستان واقعی بڑی راحت و فرحت بخش تھی۔ پوری

داستان اگر سن لی جائے تو زبان پر بس یہی الفاظ رواں ہوں گے کہ ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں ہے۔یہی کیفیت سننے والوں پر اس وقت طاری ہوئی جب پروفیسر عبدالقدیر سر گرو نے کلمات تقدیم میں اردو زبان کی تاریخ کے ہر صفحہ کو جیسے متحرک کر دیا۔

سفر میں کوئی تنہا بھی ہو تو کبھی کبھی تنہائی کا احساس نہیں رہتا اور سفر جب ان سمتوں کا ہو جن کا ہر سرا تاریخ کی وادیوں سے گزرتے ہوئے ہر علم اور ہر پرچم کی نشان دہی کرتا ہو، احمد نگر، گلبرگہ، یادگیر، رائچور، اننت پور، ادونی، بالا گھاٹ، جالنہ، کالنہ، گنٹکل، پانکل یہ مقامات ہی نہیں یہ گزرے ہوئے خدا جانے کتنے کاروانوں کے داستان گو بھی ہیں۔بستیاں بستی رہیں، زبانیں بنتی بگڑتی رہیں، جن میں حوصلہ تھا وہ زندگی کی روایت کو آگے بڑھاتے رہے جو ضعیفی کے جرم کے مرتکب ہوئے، وہ پہاڑوں اور جنگلوں کے اندھیروں کا حصہ بن کر معدوم و موہوم ہو گئے۔اردو زبان کے سفر کی داستان اسی لیے عجیب ہے، کتنی اقلیموں، کتنی زمینوں اور کتنے موسموں کو یہ زبان کیسے کیسے رنگ بخشتی گئی۔ڈاکٹر راہی فدائی، ڈاکٹر م.ن. سعید، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر نسیم الدین فریس، ڈاکٹر سید سجاد حسین، ڈاکٹر ماجد داغی، ڈاکٹر وی کے نکولن، اسلم مرزا، مولانا شبیر الحق اور مولانا ثنا احمد باقوی، عبداللہ دا ابوندوی، ڈاکٹر عبدالحمید اطہر، ڈاکٹر علم اللہ حسینی، ڈاکٹر حلیمہ فردوس، ڈاکٹر اقبال النساء، ڈاکٹر نجمہ سلطانہ، ڈاکٹر شائستہ یوسف، ان کے علاوہ اور بھی اردو کی ان فتوحات کے قصے بیان کر رہے تھے، جو تغلق و مغل فتوحات سے کم دلچسپ نہیں تھے۔کچھ انداز رجزیہ بھی تھے، جیسے جنوب والے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اردو کے تئیں محبت کا ثبوت دینے کی ضرورت نہیں وہ اس کا عملی ثبوت پیش کر چکے ہیں۔صدیوں سے یہ اردو کا علاقہ رہا ہے اور آج بھی یہ اردو کا مضبوط قلعہ ہے۔ڈاکٹر نکولن کے وی نے کیرلا میں اردو زبان کی تعلیم اور ترویج کی جو تصویر پیش کی وہ شاید شمال کے اردو کے مدعیوں کے لیے ناقابل یقین ہو، انہوں نے بتایا کہ زمانہ حال میں جنرل ایجوکیشن کے تحت دیگر تعلیمی موضوعات کے ساتھ ساتھ اردو زبان ہائی ٹیک کلاس روم میں حاصل کر سکتے ہیں، اگر ایک اسکول میں اردو پڑھنے والے دس طلبہ بھی ہوں تو مادری زبان کے ساتھ اردو بھی پڑھ سکتے ہیں۔یہ سب اس لیے کہ کیرلا میں اردو کے لیے سب سے اہم اور زبردست رول کیرلا سرکار نے ادا کیا ہے۔آج ایک لاکھ سے زیادہ طلبہ اردو پڑھتے ہیں، سالانہ پچیس ہزار طلبہ، طالبات اردو رسم الخط میں پبلک امتحانات لکھ کر کامیاب ہوتے ہیں، اسکولوں کے علاوہ ایک درجن کالجوں اور تین یونیورسٹیوں میں اردو زبان ثانوی زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے، اردو میں بی.ایڈ جیسے پروفیشنل کورسز کی سہولتیں بھی ہیں، کیرلا میں اردو فتوحات کا یہ بیان ایک غیر مسلم اردو والے کی زبان سے سن کر حیرت ہونی ہی تھی ساتھ ہی یہ ایمان بھی پختہ ہوتا جاتا تھا کہ اردو محبت کی زبان ہے اور محبت

کی تاثیر توازل سے ہے، ابد ہی اس کی منزل ہے۔

سمینار میں کچھ بڑے جیسے پروفیسر معین الدین جینا بڑے، پروفیسر مجید بیدار، ڈاکٹر ستار ساحر، ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی بعض عوارض کی وجہ سے شریک نہیں ہوسکے تاہم ان کے مقالوں نے ان کی غیر موجودگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

یہ کارنامہ بھی کم نہیں کہ سارے مقالے کتابی شکل میں اور نفاست اور سلیقہ مندی کے اہتمام سے شائع ہوگئے۔ یہ مجموعہ مقالات بجائے خود دکن والوں کے لیے باعث افتخار ہے۔

عام طور سے ہر سمینار کو کامیاب قرار دیا جاتا ہے، منتظمین کی محنت اور سلیقے کی داد دی جاتی ہے، لیکن کبھی کبھی یہ اعتراف واقعی عین حق ویقین کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے، بنگلور کے اس سمینار کو شرکاء نے ناقابل فراموش اور تاریخی قرار دیا تو اس کا بڑا بلکہ بہت بڑا سبب جناب عبیداللہ شریف اور جناب منور مبین کی بے مثال محنت ہے، ان حضرات نے جس طرح محنت اور جاں فشانی کی اور مسلسل وقت کی ہر رفتار کے مدمقابل ہوئے، ایسے منظر کم ہی نظروں سے گزرتے ہیں۔ عبیداللہ شریف صاحب کا اخبار پاسبان بنگلور کے آسمان صحافت کا روشن ستارہ ہے۔ وہ اردو صحافت کے واقعی پاسبان ہیں، لیکن ایک صحافی سے زیادہ وہ بنگلور بلکہ کرناٹک کے ملی وقومی ضمیر بھی بن چکے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی ان کی وضع داری، خاکساری، فروتنی اور ملنساری ہے، منور مبین صاحب شاعر ہیں، نعت گوئی میں ممتاز ہیں، شاید ان کی نعت کی برکت تھی کہ یہ سمینار روشن بھی رہا اور واضح بھی۔

بنگلور کا تعارف شہر گلستاں سے کرایا گیا، کیا عجب کہ یہ کبھی گلستانِ اردو کے لقب سے بھی آراستہ ہوجائے۔ ویسے بنگلور کے دارالسرور ہونے میں سبیل الرشاد، فرقانیہ اکیڈمی، اسلامی بیت المال، الامین اور مرزا خالد بیگ اور سید شبیر احمد حسینی کے تعلیمی اداروں کی خدمات ہی کافی ہیں، لیکن کمال اس غیر اردو علاقہ میں اردو صحافت کی مستقل مزاجی کا ہے، سیاست، راشٹریہ سہارا، شامنامہ، شام سے شام تک، نشیمن، سالار، زریں شعاعیں، ماہنامہ جوش وامنگ جیسے اخبارات ورسائل کی کامیاب اشاعتیں اردو اور اردو والوں کی ثابت قدمی اور مثبت عملی کی اور دکن والوں کی اولیت اور فوقیت کی دلیل بھی ہیں، پہلے کبھی مولانا سید سلیمان ندوی کی یہ عبارت نظر سے گزری تھی کہ جنوبی ہند اور مدراس میں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو نظم اور نثر اردو میں شمالی ہند کے لوگوں سے کسی طرح کم نہیں، پڑھا ہوا دیکھ بھی لیا گیا۔ اسی لیے کہہ دیا گیا کہ اب شمال کے لیے جنوب کو اسی عقیدت سے دیکھنے کی ضرورت ہے جیسے صدیوں پہلے دلی نے جنوب کو اپنے دل میں جگہ دی تھی۔

ملی مسائل

مسلم معاشرے کی خرابیاں اوران کے سدھار کی سبیل

ڈاکٹر ظفرالاسلام خان

میں ان مسائل کے بارے میں بولتا اور لکھتا رہاہوں لیکن شائد اتنی وضاحت سے نہیں جس کی ضرورت ہے۔ میری آج کی تقریر کے بعد شائد کچھ فتوے جلد ہی نکل جائیں گے جن میں میرے کافراور فاسق ہونے کااعلان کیاجائے گااور دعوی کیاجائے گا کہ میں فلاں تنظیم یاپارٹی کاایجنٹ ہوں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ اگر میری ان کھری کھری باتوں سے کچھ فائدہ ہو سکتا ہے تو میرا ذاتی نقصان میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا ہے کیونکہ قوم اور ملک کا فائدہ سب پر مقدم ہے۔

دوسرے مسائل اور بھی ہیں جن کا تعلق حکومت، عدلیہ، پولیس اور میڈیا وغیرہ سے ہے لیکن آج ہم ان کے بارے میں بات نہیں کر رہے ہیں بلکہ صرف ان امور کے بارے میں گفتگو کریں گے جو ہمارے معاشرے کے اندرونی مسائل ہیں اور جو ہماری اپنی اندرونی کمزوریاں ہیں جنھیں خود ہم ہی دور کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم اپنی سیاسی صورت حال پر نظر ڈالتے ہیں۔ آج ہم اپنے آپ کو ایک کونے میں کھڑا ہوا پاتے ہیں۔ مختلف قسم کے چیلنجز ہمارے سامنے ہیں لیکن نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا ہے۔ ہندوتوایا نفرت کی سیاست نے ہم کو ایک حد تک الگ تھلگ کر دیا ہے یا کم از کم اس کی کوشش ہو رہی ہے۔ لیکن کیا یہ سب اچانک ہو گیا؟ کیا ہم یا ہماری قیادت اس کی ذمے دار نہیں؟

ہمارے مسائل سنہ ۱۸۵۷ سے شروع ہوتے ہیں جب انگریز سامراجیوں نے ہم کو ''غدر'' کا ذمے دار قرار دے کر جی کھول کر ہم کو قتل کیا، ہماری جائدادیں چھینیں اور ہم کو حاشیے پر کھڑا کر دیا۔ بیس، تیس سال تک ہم کسی رد عمل سے قاصر رہے۔ اس دوران ایک مرد مجاہد —سید احمد خان— کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی حکمت عملی سے ایک طرف انگریزوں کا غصہ ٹھنڈا کیا اور دوسری طرف مسلمانوں کو وہ واحد راستہ دکھایا جو موجودہ دور میں ترقی کے لئے سب کو میسر ہے، یعنی جدید تعلیم۔ اس مرد مجاہد کو بڑی گالیاں دی گئیں، کافر گردانا گیا، جوتے چپل سے مارا گیا، لیکن اس نے ہار نہ مانی اور سنہ ۱۸۷۵ میں علیگڑھ میں ایک کالج بنا کر دم لیا۔ یہ کالج سنہ ۱۹۲۰ میں ایک یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے اس طرح کے اور کالج اور بعد میں یونیورسٹیاں بنیں جن کی بدولت مسلمان پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے لگے لیکن سیاسی طور پر مسلمانوں نے دوررس

حکمت عملی نہیں اپنائی بلکہ جذباتی سیاست اور جذباتی سیاستدانوں کا شکار بنتے چلے گئے۔ سنہ ۱۹۲۰ میں ہم نے تحریکِ ہجرت کے نام پر ایک احمق تحریک چلائی۔ دسیوں ہزار نوجوان اپنے گھر بار اور زمینیں اونے پونے بیچ کر "قندھار چلو، قندھار چلو۔ دریائے اٹک کے پار چلو" کا نعرہ لگاتے ہوئے افغانستان ہجرت کر گئے۔ یہ ایک پوری طرح جذباتی اور احمقانہ فیصلہ تھا۔ نعرہ لگوانے والوں نے افغانستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا بغور مطالعہ نہیں کیا تھا کہ کیا یہ لوگ وہاں بس سکتے ہیں اور ہندوستان کی آزادی کے لئے وہاں سے کیسے کام کر سکتے ہیں۔ زندگی کے عملی مسائل اور افغانی حکام کی سرد مہری کی وجہ سے چند ہی مہینے میں یہ لوگ نامراد و شکستہ حالت میں واپس چلے آئے۔ واپس آنے والوں میں خان عبدالغفار خان بھی تھے جنہوں نے باقی زندگی اس قسم کے جذباتی نعروں سے توبہ کی اور ہندوستان کی تحریک آزادی میں دل و جان سے شریک ہو گئے۔

تحریک ہجرت کی ناکامی سے ہماری جذباتی اور جوشیلی قیادت نے کوئی سبق نہیں لیا بلکہ جلد ہی ان کو ہزاروں میل دور ترکی میں خلافت عثمانیہ کو بچانے کا خیال آگیا۔ نتیجتاً اس قیادت نے پوری قوم کو تحریکِ خلافت کے نام پر کئی سال نچائے رکھا یہاں تک ۱۹۲۴ میں جب مصطفی کمال نے ترکی میں خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا تو ہندوستان میں بھی تحریک خلافت کا غبارہ پھوٹ گیا۔ ان لوگوں کو جذبات اور خیالی نعروں کے علاوہ ان زمینی حالات کا کوئی علم نہیں تھا جن کی وجہ سے خلافت عثمانیہ خود اپنے ملک اور دوسرے قریبی مسلم ممالک میں مطعون ہو چکی تھی اور خود وہاں کے لوگ اس سے گلو خلاصی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مصطفی کمال کو سلطنت ختم کرنے اور آخری خلیفہ محمد ششم کو نومبر ۱۹۲۲ میں صرف چند گھنٹوں کے نوٹس پر ترکی سے ملک بدر کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ یوں اس لایعنی تحریک نے ہندوستان میں بھی دم توڑ دیا۔

تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد ہماری جذباتی قیادت کو "پاکستان" کا نعرہ مل گیا اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں کو چھوڑ کر پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو اس مسئلے پر برسوں الجھا کر رکھا یہاں تک کہ ۱۹۴۷ میں ملک بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کی تقسیم ہوئی جس میں لاکھوں لوگ مارے گئے، نوے لاکھ کے قریب مسلمان اپنی خواہش سے یا مجبور ہو کر پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ تقسیم کے ذمے دار مسلم لیگ، کانگریس اور انگریز سب تھے لیکن ٹھیکرا عضو ضعیف یعنی ہندوستانی مسلمانوں کے سر پھوٹا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ پاکستان بننے سے باقی ماندہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ساکھ ٹوٹ گئی، قائدین پاکستان بھاگ گئے یا گھروں میں چھپ گئے۔ دانشوروں کا ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا جو اب تک بھی پُر نہیں ہوا ہے۔ معاشیات بھی ایسے تباہ ہوئی کہ مسلمان آج تک دوبارہ ۱۹۴۷ سے پہلے والی حالت پر واپس نہیں آیا ہے۔

اس کے بعد ۱۹۸۰ کی دہائی میں دو اور جذباتی تحریکوں نے ہمارے یہاں جنم لیا: شاہ بانو یا پرسنل لا تحریک اور بابری مسجد تحریک۔ دونوں تحریکوں میں عقل سے کم اور جذبات سے زیادہ کام لیا گیا۔ نعرہ لگانے والے لیڈر بن گئے اور مسلمانوں کو برسوں نچاتے رہے۔ دسمبر ۱۹۹۲ میں بابری مسجد کی شہادت کے ساتھ یہ قیادت بھی زمین دوز ہو گئی۔ تب سے آج تک ہمارے یہاں کوئی نئی قیادت نہیں ابھری ہے۔

نئے ہندوستان میں جو سماجی، سیاسی اور معاشی صورت حال بنی تھی اور جس طرح ہم ہر طرح حاشیے پر آ گئے تھے، اس کی وجہ سے جذباتی سیاست کی ناکامی نوشتۂ دیوار بن چکی تھی اور ہمیں کوئی اور طریقہ اپنانا تھا جیسے جاپان اور جرمنی نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنایا۔ ان دونوں ملکوں نے امریکہ کے خلاف مزاحمت یا جنگ جاری رکھنے کے بجائے اپنے ملک کی تعمیرِ نو کے فیصلے سے اپنی تقدیر چند دہوں میں بدل دی۔ افسوس ہے کہ ہمارے یہاں کوئی ایسی دور رس قیادت نہیں تھی جو ہم کو تعلیم اور معاشیات کی طرف موڑتی۔ نتیجۃً ہم صرف جذباتی سیاست کا شکار ہو کر اِس بند گلی سے اُس بند گلی کا چکر لگاتے رہے اور آج بھی منزل سے دور وہیں چکر لگا رہے ہیں۔ اگر مسلمانوں نے کوئی ترقی کی ہے تو وہ افراد کی اپنی ذاتی سوجھ بوجھ اور پہل کی وجہ سے ہے، ہماری قیادت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

میں یہ بالکل نہیں کہہ رہا ہوں کہ شاہ بانو اور بابری تحریکوں کا جو حشر ہوا وہی ہونا چاہئے تھا۔ یقیناً ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ہم کو معلوم ہونا چاہئے تھا کہ سیاسی اور قانونی حقوق زمینی حقائق سے الگ وجود نہیں رکھتے ہیں۔ ان مسائل کو کسی اور طریقے سے سڑک سے دور حل کرنا چاہئے تھا۔ شروع میں بابری مسجد کا مسئلہ ٹھنڈے طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی گئی جس میں مسلمانوں کی سبکی نہ ہوتی۔ لیکن جذباتی اور جوشیلے قائدین نے ان کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ نتیجۃً ہمیں ایسی ناکامی ملی ہے کہ ہم سر اٹھانے اور بولنے کے بھی قابل نہیں رہے۔

ہماری اسی جذباتی سیاست سے نفرت کی اُس سیاست کو بھی تقویت ملتی چلی گئی جو ملک کے دستوری ڈھانچے کے بدلنے کے درپے ہے حالانکہ اب بھی اس ملک میں ایسے بہت سے انصاف پسند لوگ موجود ہیں جو قانون اور دستور کی حمایت میں کھڑے ہیں لیکن ان کی تعداد بھی روز بروز کم سے کم تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

آزادی کے بعد ہماری ایک بڑی کمی رہی ہے کہ ہم نے اپنی زمینی طاقت بنانے کے بجائے چند پارٹیوں اور چند سیاستدانوں کی آنکھ بند کر کے تائید کی اور ملک کی ابھرتی ہوئی طاقتوں سے ڈائیلاگ کرنے کے بجائے، ان کو صرف چیلنج کرتے رہے۔ ان نئی طاقتوں سے کوئی تال میل نہ بنانا بلکہ الٹا انھیں دشمن بنا لینا کسی طرح کی

عقلمندی نہیں تھی۔ آج بھی ضرورت ہے کہ ہم کسی ایک پارٹی کی تائید کرنے یا لوگوں کو صرف اسے ووٹ دینے کی صلاح دینے کے بجائے عوام پر چھوڑ دیں کہ وہ عمدہ کارکردگی کی بنیاد پر جس امیدوار کو چاہیں اپنے حلقے میں ووٹ دیں۔ پچھلے سالوں میں ہم نے دیکھ لیا کہ کوئی سیاسی پارٹی ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ ہم پر بڑے سے بڑے طوفان آئے لیکن کوئی بولنے تک کو تیار نہیں ہے۔ ایسے حالات میں ہم کیوں کسی سیاسی پارٹی کا دم چھلہ بنیں اور کیوں کسی سیاسی پارٹی سے دشمنی کو اپنی ملی سیاست بنائیں۔

اپنے حقوق کے لئے اور مظالم کے خلاف اداروں اور عدالتوں کے ذریعے ہماری حقوق کی لڑائی قانون کے تحت جاری رہنی چاہیے۔ لیکن یہ کچھ افراد اور تنظیمیں کریں گی، پوری قوم کو ہم ان امور پر سڑکوں پر نہیں لائیں گے اور نہ ہی علانیہ کسی کے خلاف سب و شتم کے مرتکب ہونگے۔ اس قانونی لڑائی میں ہم سماج کے ایک بڑے حصے کو دشمن نہیں بنائیں گے۔ ہم کو سماج کی تمام نمائندہ طاقتوں اور پارٹیوں کے ساتھ تعلقات، بات چیت اور ڈائیلاگ جاری رکھنا چاہیے۔ سیاست میں کوئی اچھوت نہیں ہوتا ہے۔ ہمیں بھی اس حکمت پر عمل کرنا چاہیے۔

ہمارے ساتھ یہ مسئلہ بھی رہا ہے کہ جن مسائل کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ وہ براہ راست ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں، ہم انھیں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ سماج میں جو دوسرے مسائل ہیں اور جو زیادتیاں ہو رہی ہیں ہمیں ان سے سروکار نہیں ہوتا ہے۔ ہمیں یہ رویہ بدلنا ہوگا اور ہمیں ان سارے مسائل میں دلچسپی لینی ہوگی جن کا ملک کے حاضر اور مستقبل سے تعلق ہے۔

معاشی مسائل: ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت غریب ہے۔ ہماری تنظیموں نے آج تک مسلمانوں کی معاشی حالت بہتر کرنے کے لئے کوئی نقشہ یا پروگرام نہیں بنایا۔ ہر مصیبت ان کو چندہ جمع کرنے کا موقع نظر آتی ہے۔ ''سود'' کے حرام ہونے کے نام پر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو قرضہ نہیں دیتا ہے۔ تنظیموں نے اس کے لئے کوئی نظم نہیں بنایا۔ ایسی حالت میں جو مسلمان کسی وجہ سے قرضے کے محتاج ہوتے ہیں وہ دوسروں سے، اور اکثر مسلمانوں سے ہی، بڑے اونچے سودی ریٹ پر قرضہ لیتے ہیں جس سے وہ برباد ہو جاتے ہیں۔ ''اسلامی معاشیات'' کا برسوں سے بڑا غلغلہ ہے لیکن آج تک کوئی ایسا قابل عمل ماڈل نہیں بن سکا جس سے غریب لوگوں کی بروقت مدد ہو یا غریب لوگ جہاں اپنی کمائی پونجی جمع کر سکیں۔ ہندوستان کے باہر جو ''اسلامی بینک'' بنے ہیں وہ ناکام ہیں بلکہ میرے ذاتی تجربے میں وہ عام بینکوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ یہ سنہ ۱۹۸۴ کی بات ہے کہ میں نے قاہرہ میں واقع فیصل اسلامی بینک میں پانچ ہزار ڈالر بطور انوسٹمنٹ جمع کئے۔ حساب کھولنے اور پیسے جمع کرنے کے لئے انہوں نے ''سروس'' کے نام پر چند سو ڈالر لئے جو کوئی بینک نہیں لیتا ہے۔

اس کے بعد میں ہندوستان آ گیا اور مجھ کو یہاں پیسوں کی ضرورت پڑی تو وہ مذکورہ اکاؤنٹ بند کرنے کے لئے میں نے فیصل اسلامی بینک کو خط لکھا۔ انہوں نے حساب بند تو کر دیا لیکن ایک سال سے کم مدت میں بند کرنے کی سزا کے طور پر دوبارہ مجھ سے چند سو ڈالر اور کاٹ لئے۔ ایک عام بینک یہ کبھی نہیں کرے گا بلکہ زیادہ سے زیادہ انٹرسٹ میں سے کچھ رقم منہا کر لے گا۔

یہاں ہندوستان میں کافی دنوں سے اسلامی بینکنگ یا اسلامی فائننس کمپنیوں کا شور وقتاً فوقتاً اٹھتا رہتا ہے لیکن یہ سب ہمارے پیسوں کو لوٹنے والی کمپنیاں ہیں جیسے المیزان اور الفلاح نامی ادارے جن کو ہمارے بعض مفتیان نے فتوے بھی دے رکھے تھے۔ ایسی کمپنیوں میں ہزاروں کروڑ کھونے کے باوجود ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل نوھیرہ شیخ نامی عورت نے بھی مسلمانوں کے ہزاروں کروڑ روپئے اسلامی فائننس کے نام پر تباہ کئے۔ اس کے علاوہ مختلف شہروں میں اسلامی فنڈ نام کی چھوٹی چھوٹی دکانیں قائم ہیں جن سے مسلمانوں کی ضروریات نہیں پوری ہوتی ہیں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی معاشی ترقی نہیں ہوتی اور رہی سہی پونجی بھی برباد ہو جاتی ہے نیز کوئی معقول بزنس کرنے کے لئے ان کو کوئی قرض دینے والا بھی نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ہمارے ایسے لاکھوں لوگ موجود ہیں جو بینکوں سے ملنے والے انٹرسٹ کو وہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ بعض اخباری رپورٹوں میں دعوی کیا گیا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس طرح ہر سال ہزاروں کروڑ روپئے بینکوں میں چھوڑ دیتے ہیں یا بینکوں میں اپنے پیسے ہی نہیں رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے پیسے کالا دھن میں شمار ہوتے ہیں۔ نومبر ۲۰۱۶ میں نوٹ بندی کی وجہ سے ایسے لوگوں کا بڑا نقصان ہوا جو اپنے پیسے گھروں میں رکھتے تھے۔ ہمارے ایک رشتہ دار ہر سال انٹرسٹ کی رقم بینک سے نکال کر اسے جلاتے تھے حالانکہ انہیں کے شہر میں ہزاروں غریب و فقیر مسلمان رہتے تھے جن کے لئے مجبوراً سور کا گوشت کھانا بھی حلال ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات قابل غور ہے کہ بینکوں کا انٹرسٹ یا منافع وہ ''سود'' یعنی ربا نہیں ہے جس کو اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بینک ہم سے قرضہ نہیں لیتا ہے بلکہ ہم خود بینک میں اپنی ضرورت اور حفاظت کی خاطر اپنے پیسے جمع کراتے ہیں، پھر وہ ان پیسوں کو دوسروں کو قرضے پر دے کر ان سے منافع لیتا ہے جس کا کچھ حصہ پیسہ جمع کرنے والوں کو ملتا ہے اور یہ حصہ متعین نہیں ہوتا ہے بلکہ کم یا زیادہ ہو سکتا ہے اور کبھی نہیں بھی ملتا ہے۔ عصر حاضر میں افراط زر (Inflation) کی وجہ سے پیسوں کی قیمت مستقل کم ہوتی رہتی ہے جو ہمارے ملک میں کم از کم ۹-۱۰ فیصد سالانہ ہوتی ہے۔ جب تک سونے اور چاندی کے سکوں کا رواج تھا افراط زر کا وجود نہیں تھا، بلکہ صدیوں سامانوں کے دام ایک ہی رہتے تھے۔ اب جو

رقم ہمیں بینک ''انٹرسٹ'' کے نام پر دیتا ہے وہ افراط زر کے آس پاس ہوتی ہے۔ گویا ہمارا پیسہ قیمت کے لحاظ سے اتنا ہی رہا جتنا ایک سال قبل تھا۔

آج کا ''انٹرسٹ'' وہ نہیں ہے جو عرب میں ''ربا'' کے نام پر رائج تھا۔ جو زائد رقم، عرب میں ''ربا'' کے نام سے جانی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ ایک آدمی دوسرے سے ایک مدت کے لئے پیسے قرض لے جس پر شروع میں کوئی سود نہیں ہوتا تھا، لیکن جب مقروض مقررہ مدت میں قرض نہ لوٹا سکے تو قرضہ دینے والا اس کو مزید مہلت اس شرط پر دیتا تھا کہ اصل رقم کے علاوہ قرضدار مزید کچھ رقم ادا کرے گا۔ اگلی مقررہ مدت پر واپس نہ کرنے پر یہ رقم یک طرفہ طور پر مزید بڑھادی جاتی تھی جس کے سامنے قرضدار بے بس تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ کوئی جنس جیسے آٹا یا کھجور قرضے پر لی جائے اور کچھ عرصے کے بعد اسی جنس میں کچھ اضافہ کر کے اسے واپس کیا جائے۔ متعینہ حالات میں یہ صورت بھی منع کی گئی ہے۔ مختصراً یہی وہ ''ربا'' ہے جسے منع کیا گیا ہے۔ ہم نے ''ربا'' کا ترجمہ سود یا بیاج کر کے اپنے لئے بلاوجہ مصیبت کھڑی کر لی ہے۔

اس مسئلے کے بارے میں، میں نے سنہ ۱۹۹۹ میں علامہ اقبال سہیل کی کتاب ''ربا کیا ہے؟'' کو اردو، انگریزی اور عربی میں شائع کیا تھا اور اس کی کاپیاں ملک کے اندر اور باہر کے علماء اور مفتیان کو بھیجی تھی۔ آج تک اس کتاب کا کوئی جواب میرے سامنے نہیں آیا ہے، البتہ شام کے مفتی اعظم شیخ احمد کفتارو نے ضرور جواب دے کر میرا شکریہ ادا کیا تھا کہ تم نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔

''سود'' ایک بڑا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے مسلم معاشرہ بہت سے مسائل میں گھرا ہے اور آگے نہیں بڑھ پارہا ہے کیونکہ ہم نے راستے بند کر دئے ہیں اور کوئی متبادل نہیں فراہم کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ہمارے کچھ علماء نے انشورنس کو بھی حرام قرار دے رکھا ہے جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو فسادات اور دوسری ناگہانی مصیبتوں میں نقصان کے بعد اپنے پاؤں پر دوبارہ کھڑے ہونے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔

تعلیم: تعلیمی طور سے ہندوستان کے مسلمان دوسرے گروپوں سے پیچھے ہیں۔ ہمارا ۴۰۔۴۵ فیصد معاشرہ ناخواندہ ہے۔ اسکول چھوڑنے (ڈراپ آؤٹ) والے بچوں کی نسبت ہمارے یہاں سب سے زیادہ ہے جب کہ ہمارا دین روز اول سے علم حاصل کرنے کی ہمیں تلقین کر رہا ہے۔ علم میں یقیناً دینی علوم شامل ہیں لیکن دوسرے دنیاوی علوم بھی اسی طرح اہم ہیں۔ جب اللہ کے رسول ﷺ نے ہم سے کہا کہ ''علم حاصل کرو چاہے چین میں ہی کیوں نہ ہو'' تو اس کا مطلب دینی علوم تو نہیں تھے۔ ہمارا فرض ہے کہ زمانے اور حالات کے لحاظ سے جو علوم بھی مطلوب ہیں ان کو سیکھیں اور ان میں امتیاز حاصل کریں۔ ہمارے قدیم مدارس میں دینی علوم اور دنیاوی علوم کی تفریق نہیں تھی بلکہ

وہیں سے مفسر اور عالم حدیث پیدا ہوتے تھے اور اُنھیں مدرسوں سے ریاضیات، فلک اور طب کے ماہرین بھی نکلتے تھے۔ مغربی سامراج کے آنے کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹا اور مسلمانوں نے ایسے پرائیویٹ مدرسے بنانے شروع کردئے جہاں دینی کیا بلکہ صرف مسلکی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اس بنیاد پر شروع کیا گیا تھا کہ کہیں سرکاری مدارس کے ذریعے سامراجی حکمران ہمارے دین میں بھی دخل اندازی نہ شروع کردیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ یہ پرائیویٹ مدرسے اور ان کا نظامِ تعلیم مقدس ہوگئے ہیں۔ اب ان میں کسی تبدیلی کی بات کی جاتی ہے تو دین خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

سچر کمیٹی کے مطابق ہندوستان میں تقریباً ۳۲ ہزار مدرسے ہیں لیکن ہمارا ذاتی خیال ہے کہ پرائیویٹ مدارس کی تعداد کئی لاکھ ہے۔ یہ مدارس ابتدائی، متوسط، ثانوی اور عالمیت وفضیلت کے درجات تک کے ہیں۔ ان میں ہمارے تقریباً ۱۰ فیصد بچے پڑھتے ہوں گے۔ ۸، ۱۰ اور ۱۲ سال گذارنے کے بعد جب یہ طلبہ مدارس سے باہر نکلتے ہیں تو وہ اس دنیا کے لائق نہیں رہتے ہیں بلکہ صحیح معنوں میں ان کو دینی علوم اور عربی زبان پر بھی پوری دسترس نہیں ہوتی ہے۔ وہ جدید عربی لکھنے اور بولنے پر قادر نہیں ہوتے ہیں۔

مدارس کے نصاب کی اصلاح کی باتیں تقریباً ایک صدی سے چل رہی ہیں لیکن عملاً کوئی اصلاح بہت کم اور بہت دیر میں آتی ہے۔ ضرورت یہ تھی کہ یہ مدارس دینی اور عصری دونوں تعلیم دیتے اور ان سے نکلنے والا نوجوان ہائی اسکول اور سینئر سیکنڈری اسکول کے سرٹیفکٹ لے کر باہر نکلتا۔ آج یہ نوجوان جو سند لے کر نکلتا ہے اس کی دنیا میں کوئی قیمت نہیں۔ وہ صرف امام، مؤذن یا کسی مدرسے میں تدریس کے لائق ہوتا ہے۔ اگر زیادہ تیز وطرار ہوتا ہے تو ایک اور مدرسہ کھول لیتا ہے۔ چند سو فارغین مدارس بعض ہندوستانی یونیورسٹیوں میں داخلے لے کر انسانیات کے کچھ کورس کر لیتے ہیں یا ان میں سے دس، بیس بعض عرب یونیورسٹیوں میں داخلے پا جاتے ہیں۔ لیکن ان فارغین مدارس کی اکثریت عظمیٰ حاشیے پر زندگی گذارنے پر مجبور ہوتی ہے۔

میں نے کئی سال قبل جامعہ ازھر کے اسکولوں (معاہد ازہریہ) کے طرز پر ہندوستان میں مدارس کا نصاب بنانے کی تجویز رکھی تھی لیکن کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ جامعہ ازھر کے اسکولوں میں ایسی جدید وقدیم تعلیم ہوتی ہے کہ میٹرک کرنے کے بعد بچہ کسی بھی اسٹریم میں جا سکتا ہے۔ ہندوستان کا ایک مدرسہ خود کو ''ازہر ہند'' کہتا ہے لیکن اصلی ازہر جو مصر میں ہے، جہاں میں نے بھی تعلیم حاصل کی ہے، یہاں کے مدارس سے بہت مختلف ہے۔ ایک تعلیمی ادارے کے طور سے جامع ازھر ہزار سال قبل ایک مسجد سے شروع ہوا تھا لیکن زمانے کے لحاظ سے وہ خود کو بدلتا گیا۔ آج وہ ایک بین الاقوامی معیار کی یونیورسٹی ہے جس کے شہر نما کیمپس میں ہر علم وفن کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس کی اسناد دنیا کی ہر یونیورسٹی میں قبول

کی جاتی ہیں جبکہ ہمارے بعض مدارس کی سندیں سوائے چند ہندوستانی اور عرب جامعات کے کہیں منظور نہیں ہیں اور وہ بھی صرف کچھ کورسیز کے لئے۔ بعض ہندوستانی یونیورسٹیوں نے کچھ متعینہ مدارس کی اسناد کو صرف کچھ کورسیز میں داخلے کے لئے منظور کیا ہے لیکن لگ رہا ہے کہ نئی داخلہ پالیسی کے تحت غالباً یہ سہولیت بھی ختم ہو جائے گی کیونکہ یونیورسٹیوں میں داخلے کے لئے اب کامن یونیورسٹی انٹرنس ٹسٹ (CUET) لازم ہونے جارہا ہے جس کے لئے سینئر سیکنڈری اسکول کا سرٹیفیکیٹ لازمی ہوگا۔ اس سال سے ۴۲ یونیورسٹیوں میں یہ ٹسٹ لازمی کیا جارہا ہے اور دھیرے دھیرے تمام یونیورسٹیوں میں اسے لازمی کردیا جائے گا۔ مدارس کے فارغین اس ٹسٹ میں شریک ہی نہیں ہوسکیں گے کیونکہ ان کی اسناد منظور شدہ نہیں ہیں اور وہ درخواست ہی نہیں دے پائیں گے۔ اس خطرناک صورت حال کی ارباب مدارس کو خبر ہی نہیں بلکہ شاید ان کو اس سے خوشی ہو کہ اب ان کے طلبہ یونیورسٹیوں میں نہیں جاپائیں گے۔

تقریباً ۱۰-۱۲ سال قبل یوپی اے سرکار نے مدرسہ مرکزی بورڈ بنانے کی تجویز رکھی تھی لیکن بعض بڑے مدارس کی مخالفت کی وجہ سے حکومت پیچھے ہٹ گئی اور اب کوئی اس کی بات نہیں کر رہا ہے۔ میرے خیال میں اب بھی ضرورت ہے کہ حکومت اس طرح کا مرکزی بورڈ بنائے تاکہ مدارس کی اسناد کو سرکاری حیثیت مل سکے۔ جس مدرسے کو اس نظام میں شمولیت سے پریشانی ہو وہ اس سے دور رہے لیکن باقی مدارس کو محروم نہ کرے۔

اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے عصری اسکولوں کی حالت بھی بالعموم اچھی نہیں ہے۔ ہمارے اسلاف نے تقریباً ہر شہر اور ہر قصبے میں اسلامیہ اسکول یا اسی طرح کے کسی نام سے اسکول قائم کئے تھے۔ کہنے کو تو یہ اسکول آج بھی موجود ہیں لیکن مقامی لوگ وہاں اتنی سیاست بازی کرتے ہیں کہ نہ ایسے اسکولوں کا نظام ٹھیک ہے اور نہ ان میں اچھی تعلیم ہوتی ہے، جس کی وجہ سے مسلمان بچوں کو اچھی تعلیم نہیں ملتی ہے یا وہ دوسرے اسکولوں میں جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ نتیجتاً ہمارے بچوں کو زیادہ فیس دینے کے ساتھ طعنے بھی سننے کو ملتے ہیں اور کرناٹک میں حجاب جیسے مسائل سے بھی جوجھنا پڑتا ہے۔

اردو کے لئے ہم بہت روتے ہیں لیکن ہم اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے ہیں۔ اگر ہماری نئی نسل اردو نہیں پڑھے گی تو اردو کیسے باقی رہے گی؟ اسرائیل میں یہودیوں نے عبرانی زبان کو، جو دو ہزار سال سے مردہ تھی، زندہ کردیا اور وہ آج ایک بہت ترقی یافتہ زبان ہے۔ اور ہم ہیں کہ ایک زندہ زبان کی بھی حفاظت نہیں کر پارہے ہیں۔ اپنے بچوں کو اردو پڑھائے بغیر، اس کو استعمال کئے بغیر، اردو اخبارات اور کتابیں خریدے بغیر یہ زبان کس طرح باقی رہے گی؟ جو کام ہم خود کر سکتے ہیں وہ نہیں کرتے ہیں اور بس دوسروں کو کوستے ہیں کہ

انھوں نے اردو ختم کردی۔ اگر ہم اردو سے کٹ گئے تو وہ عظیم ملی سرمایہ جو لاکھوں کتابوں میں محفوظ ہے، ہم اس سے محروم ہو جائیں گے اور یہ ناممکن ہے کہ ہم اس سرمائے کو کسی اور ہندوستانی زبان میں منتقل کر پائیں گے۔ ہمیں اپنی شناخت کے لئے اردو کی حفاظت کرنی ہے۔

تنظیمیں: کہنے کو تو ہمارے یہاں ہزاروں مقامی سے لے کر "آل انڈیا" تنظیمیں ہیں لیکن ان میں آپس میں کوئی میل ملاپ اور تعاون نہیں ہے۔ مختلف پروگرام ہر تنظیم کر رہی ہے۔ بار بار درخواست کرنے پر بھی وہ نہیں بتاتے ہیں کہ وہ کس کس کی مدد کر رہے ہیں، جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ بعض شاطر لوگ مختلف اداروں سے مدد حاصل کر لیتے ہیں اور حقدار محروم رہ جاتے ہیں۔ ہم نے ایک تجویز مختلف تنظیموں کو بھیجی کہ ایک مشترکہ ویب سائٹ ہونی چاہئے جس میں مختلف مدوں میں امداد پانے والوں کے نام اور ان کو دی جانے والی رقوم اپلوڈ کی جائیں تاکہ ایک ہی شخص کو کئی جگہ سے مدد نہ ملے۔ لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ ہر تنظیم سمجھتی ہے کہ بس وہی کام کر رہی ہے۔ بعض شاطر لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کی خوب تشہیر کرتے ہیں لیکن شاذونادر ہی کوئی تنظیم اپنے آڈیٹ شدہ اکاؤنٹس کو عام کرتی ہو یا اپنے ویب سائٹ پر ڈالتی ہو۔

سماجی مسائل: سماجی طور سے ہمارے خاندان بکھر رہے ہیں۔ اصل امور جیسے تعلیم اور کاروبار وغیرہ پر توجہ نہیں ہے۔ جو پیسے بھی ہیں ان کو غلط رسوم بالخصوص شادیوں پر بے تحاشہ خرچ کرکے اڑایا جارہا ہے بلکہ اس کی وجہ سے لوگ بری طرح مقروض ہو رہے ہیں اور آباء واجداد کی جائدادوں کو بلاوجہ کے دکھاوے کے لئے فروخت کر رہے ہیں۔ جن کے پاس ذرا سے پیسے ہیں وہ بار بار دکھاوے کے لئے حج اور عمرے کر رہے ہیں جبکہ یہاں، غرباء، مدارس اور یتیم خانے وغیرہ بہت بری حالت میں ہیں۔ صرف فیس نہ دے پانے کی وجہ سے لاکھوں لوگ اپنے بچوں کو ہر سال اسکولوں سے نکال لیتے ہیں۔

میراث کے معاملے میں ہم تقریباً پوری طرح شریعت کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ شاذونادر ہی شریعت کے مطابق میراث کی تقسیم ہو رہی ہے بلکہ طاقتور افراد کمزور رشتہ داروں کو ان کے شرعی حق سے محروم کرتے ہیں اور بالعموم ہماری عورتوں کو ان کا حق نہیں ملتا ہے۔

اوقاف کی زمینیں اور جائدادیں ہمارے آباء واجداد نے بہت سے فلاحی کاموں اور مقاصد کے لئے وقف کی تھیں لیکن آج ان پر زیادہ تر قبضہ ہو چکا ہے اور قبضہ کرنے والوں میں مسلمان سب سے آگے ہیں۔

مسلم محلوں میں شراب، جوا، سود وغیرہ کا ارتکاب اب کھلے عام ہو رہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اچھے اور دیندار لوگوں کو پرواہ نہیں کہ ان کے پڑوس میں کیا ہو رہا ہے۔ ضرورت تھی کہ مقامی سماج سدھار کمیٹیاں بنتیں

اور ایسے جرائم کا سدباب خود کیا جاتا لیکن لگتا ہے کہ ہم بہت بے حس ہو چکے ہیں۔ان فضول خرچیوں اور سماجی برائیوں کے بارے میں ہمارے علماء بھی کمر نہیں کستے۔وہ انھیں شادیوں اور لایعنی تقریبوں میں نظر آتے ہیں جس کے بارے میں وہ معاشرے کو اپنی تقریروں اور تحریروں میں خبردار کرتے ہیں۔

سماجی برائیوں میں ذات پات کا مسئلہ بھی ہے جو ہمارے اندر مقامی اثرات کی وجہ سے سرایت کر گیا ہے اور ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح کھا رہا ہے۔اسلام میں ذات پات کی کوئی جگہ نہیں ہے۔اسلام تو ہم کو بتاتا ہے کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں اور سارے انسان برابر ہیں کیونکہ سب آدم کی اولاد ہیں۔ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''کسی عربی کو کسی عجمی پر فضل نہیں ہے سوائے تقوی سے''۔

سماج کے مسائل میں صحت کے امور سے غفلت اور مضر مرغن غذائیں کھانا بھی شامل ہے جو ہمارے ہر گھر کا مسئلہ ہے۔ان مضر غذاؤں کی وجہ سے ہمارے معاشرے کے اکثر لوگ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہیں اور اسپتالوں میں پیسے لٹاتے ہیں۔اگر ہم اپنی صحت کا کچھ خیال کریں اور غلط قسم کی مرغن اور مصالحہ دار غذاؤں سے پرہیز کریں تو ہم بہت سے امراض سے محفوظ ہو سکتے ہیں اور اپنے پیسے بھی بچا سکتے ہیں۔

ہم پرسنل لا کی حفاظت کی تو بڑی باتیں کرتے ہیں لیکن ہماری آپس کی لڑائیاں محلہ سدھار کمیٹیوں یا دار القضا میں حل نہیں کی جاتی ہیں بلکہ ہم ان کو عدالتوں میں لے جا کر جھوٹی شان کے لئے لاکھوں روپئے وکیلوں کو دے کر خود کو برباد کرتے ہیں۔

اخلاقی گراوٹ: میرے نزدیک ہمارے سارے مسائل میں سرِ فہرست ہماری اخلاقی تنزلی کا مسئلہ ہے۔یہ صحیح ہے کہ عمدہ اخلاق کے حامل لوگ آج بھی ہماری سوسائٹی میں نظر آتے ہیں لیکن عمومی حالت اخلاقی تنزلی کی ہے۔آج ہماری عمومی حالت یہ ہے کہ دیگر اقوام کی بہ نسبت ہم میں اخلاقی ابتری زیادہ ہے۔ جھوٹ بولنا، امانت میں خیانت کرنا، وعدہ خلافی کرنا ہمارا وطیرہ بن چکا ہے۔اور یہی وہ صفات ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کہا تھا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک خصلت بھی کسی آدمی کے اندر ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے اور اگر یہ تینوں خصلتیں کسی انسان میں پائی جائیں تو وہ پورا منافق ہے۔یہ گویا ایک معیار ہے جس سے ہم ناپ سکتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں یا نہیں ہیں۔ہمارے لئے یہ بہت تشویش کا مقام ہے کہ ہماری کثیر آبادی میں یہ تینوں بری خصلتیں موجود ہیں جن کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پندرہ سو سال قبل وارننگ دے دی تھی کہ جن میں یہ خصلتیں ہوں وہ منافق ہے اور یہ ہم جانتے ہیں کہ منافق کا آخری مقام جہنم ہے۔

یہ مسئلہ ہمارے لئے سر فہرست ہونا چاہئے کہ کس طرح مسلمانوں کی اخلاقی ابتری کو سدھارا جائے

اور ان کو اللہ پاک سے ڈرنے والے بندے بنایا جائے جو بڑے سے بڑے دنیاوی فائدے کے لئے بھی نہ جھوٹ بولتے ہوں، نہ وعدہ خلافی کرتے ہوں اور نہ امانت میں خیانت کرتے ہوں۔

اس اخلاقی ابتری کی ایک بڑی وجہ ہمارا کلام اللہ یعنی قرآن پاک سے دور ہونا ہے۔آج اکثر مسلمان قرآن پاک نماز میں یا ثواب کے لئے بغیر سمجھے ہوئے پڑھتے ہیں لیکن اُس ابدی ہدایت کے لئے نہیں پڑھتے ہیں جس کے لئے ہمارے اکثر لوگوں کو قرآن پاک کا ترجمہ پڑھنا چاہئے جو آج تقریباً تمام زبانوں میں میسر ہے۔قرآن پاک کے ذریعے اللہ پاک ہم سب سے ذاتی طور پر مخاطب ہیں۔لیکن افسوس ہے کہ ہم اللہ کا پیغام اللہ کی کتاب سے نہیں بلکہ کچھ مولویوں سے حاصل کرتے ہیں جو کلام اللہ کے بجائے دین کو بعض فقہی کتابوں سے حاصل کرتے ہیں بلکہ ان میں سے بعض کی جرأت تو اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ عوام کو قرآن پاک کا ترجمہ پڑھنے سے ہی منع کرتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں عوام اس سے گمراہ ہو جائیں گے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک زندہ کلام کو چھوڑ کر ہم کچھ مولویوں کی خودساختہ آراء کو سنتے ہیں اور ان سارے تعصبات کا شکار ہو جاتے ہیں جو ان کو ان کے مسلکی مدرسوں میں رٹائے جاتے ہیں۔

اسی مسئلے کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنی مسجدوں کو صرف عبادت کے لئے مخصوص کر دیا ہے جب کہ مسجدیں ہماری قوم کا مرکز ہیں اور حضور پاک ﷺ اور خلفاء راشدین کے دور میں ایسے ہی تھیں۔ یہاں ہماری میٹنگیں ہونی چاہئیں، شادی بیاہ ہونا چاہئے، بچوں کی تدریس و تربیت ہونی چاہئے، محلہ سدھار کمیٹیوں کی میٹنگ اور کانفرنسیں یہیں ہونی چاہئیں۔لیکن آج ایسا نہیں ہو رہا ہے بلکہ نماز کے فوراً بعد مساجد کے دروازوں پر تالے ڈال دیے جاتے ہیں۔یہی نہیں بلکہ ہم نے مسجدوں کو مسلکوں میں بانٹ لیا ہے، دوسروں کو ''اپنی'' مسجدوں میں آنے نہیں دیتے ہیں، اگر آگئے تو ان کو برا بھلا کہتے ہیں بلکہ ان پر حملہ بھی کر دیتے ہیں۔جبکہ اللہ پاک نے کہا ہے کہ ''مسجدیں اللہ کی ہیں'' (المساجد للہ)۔اسی مسئلے کا ایک اور حصہ یہ ہے کہ ہم نے عربی میں خطبے پر اصرار کرکے اس عظیم ہفتہ وار تدریسی و تربیتی موقعے کو ضائع اور معطل کر دیا ہے۔خطبۂ جمعہ ہر ہفتے عوام کی تلقین و تربیت کے لئے تھا لیکن عربی خطبے پر اصرار کرکے ہم نے اس کی افادیت معطل کر دی ہے۔

اگر ہم کو اپنی اور اپنی آنے والی نسلوں کے بارے میں کچھ فکر ہے، اگر ہم قوم و ملک کی بھلائی چاہتے ہیں تو ہمیں ان باتوں پر سنجیدگی سے سوچنا ہوگا اور اپنی اصلاح کا سنجیدہ پروگرام بنانا ہوگا۔[1]

---

[1] یہ مقالہ ''امپار'' کی لیڈرشپ کانفرنس منعقدہ انڈیا اسلامک کلچرل سنٹر دہلی میں ۲، اپریل ۲۰۲۲ کو پیش کیا گیا۔

اخبار علمیہ

ارجنٹائن میں صنفی نیوٹرل (غیر جانب دار) زبان والفاظ پر پابندی

دوستوں کے لیے ہسپانوی لفظ امیگوس ''Amigos'' کے بجائے کچھ ہسپانوی بولنے والے امیگوز ''Amiguse'' استعمال کرتے ہیں۔ ٹوڈس ''Todus'' یا آل ''All'' کی جگہ ٹوڈوکس ''Todoxs'' لکھتے ہیں اور کچھ علامتیں جنہیں بین وینڈس ''Bienvenidos'' یا ویلکم ''welcome'' کے طور پر کہا جاتا ہے۔ اب اسے بی وینڈس ''Bievenids'' کہتے ہیں۔ وہ تبدیلیاں جو بیونس آئرس کے اسکولوں میں اساتذہ کے ذریعہ غیر رسمی طور پر اختیار کی گئی تھیں، ان میں ایسے لوگوں کو شامل کرنے کی دانستہ کوشش ہوئی تھی جن کی شناخت ایسی نہیں تھیں کہ وہ مذکر اور مؤنث لفظوں میں تمیز یا ان کی درجہ بندی کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اسی طرح لاطینی امریکا کے ساتھ ساتھ انگریزی اور فرانسیسی سمیت دیگر زبانوں میں نیوٹرل (غیر جانب دارانہ) زبان کو متعارف کرایا جارہا ہے۔ لیکن کچھ ہسپانوی بولنے والوں کے لیے جن میں بہت سے ماہرین تعلیم اور سیاست داں شامل ہیں، دنیا بھر میں ڈیڑھ ارب لوگوں کے ذریعہ بولی جانے والی زبان کو تبدیل کر دیتے ہیں اور ان کو نیچا دکھاتے ہیں۔ ارجنٹائن میں تناؤ رائے عامہ کی جنگ سے پالیسی کی جنگ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ملک کے دارالحکومت بیونس آئرس میں شہری حکومت نے گزشتہ ماہ اساتذہ پر کلاس (یعنی تدریس) کے دوران اور والدین کے ساتھ بات چیت میں صنفی نیوٹرل (غیر جانب دارانہ) الفاظ استعمال کرنے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ شہر کے وزیر تعلیم نے کہا تھا کہ اس طرح کی زبان ہسپانوی اصولوں کی خلاف ورزی اور طلبہ کی پڑھنے کی سمجھ میں رکاوٹ ہے۔ اس سے پہلے کی پالیسیوں میں سے کسی بھی عام جگہ پر خاص طور سے نیوٹرل زبان کے استعمال پر پابندی عائد کی گئی ہے جس نے شدید رد عمل کو جنم دیا ہے۔ ارجنٹائن کے اعلیٰ تعلیمی عہدہ دار نے اس اصول پر تنقید کی اور کم از کم پانچ تنظیموں نے اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ وزیر تعلیم نے اس اقدام کا موازنہ فرانسسکو فرانکو کی فاسسٹ آمریت کے تحت بائیں بازو کی تحریر کے خلاف پابندیوں سے کیا۔ انہوں نے سوچا کہ وہ کچھ درست کر رہے ہیں لیکن یہ (مسئلہ) بہت گہرائی تک جاتا ہے۔ انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ طلبہ ارجنٹائن کی ثقافت میں موجود جنس پرستانہ رویوں سے لڑنے کے لیے نیوٹرل صنفی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ رومانوی زبانوں بشمول ہسپانوی، فرانسیسی، اطالوی اور پرتگالی میں نیوٹرل صنفی اصطلاحات پر بحث خاص طور پر شدید ہو سکتی ہے کیونکہ تمام قواعد صنفی ہیں۔ ''e'' ''@'' اور ''x'' جو ''o'' اور ''a'' کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ جو اکثر

لفظ کی جنس (یعنی تذکیر وتانیث) کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ ۲۰۲۰ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ہسپانوی لفظ مور فولوجی ''اجنبی'' کے طور پر استعمال کیا گیا۔ پچھلے سال فرانس کے وزیر تعلیم نے وزارت مواصلات اور اسکولوں میں جذباتی تحریروں سے گریز کرنے کی سفارش کی تھی۔ ایک فرانسیسی لغت نے گزشتہ اکتوبر میں اس وقت غم وغصہ کا اظہار کیا جب اس میں ''iel'' کو ایک صنفی ضمیر کے طور پر شامل کیا گیا۔ یہ بحث لاطینی امریکا میں ابھرتی ہوئی جنگ کا حصہ بن گئی ہے۔ دسمبر میں یوراگوئے کی پبلک ایجوکیشن ایجنسی نے ایک میمو جاری کیا جس میں جامع زبان کے استعمال کو محدود کیا گیا ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا، وارانسی ایڈیشن۔ ۲۳-۷-۲۲ء ص ۱۲)

قابل اعتراض لفظوں پر آندھرا حکومت کی پابندی

ایک خبر کے مطابق آندھرا پردیش حکومت نے ایسے چند لفظوں بشمول منگلی (mangili)، منگلوڈا (mangaloda)، بوچو گورگیواڈا (bochu gorigevada) منگلیڈی (mangalidi) اور کونڈا منگلی (konda mangali) وغیرہ پر پابندی لگادی ہے جن سے نائی سماج کی توہین ظاہر ہوتی ہے۔ تیلگو زبان میں یہ الفاظ حجام کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ حکومت نے اس سلسلہ میں احکامات جاری کیے ہیں۔ جن لوگوں نے اب سے یہ الفاظ استعمال کیے وہ متعلقہ آئی پی ایس دھارا کے تحت قانونی کارروائی کے مستوجب قرار دیے جائیں گے۔ بی سی بہبود کے محکمہ میں جی جے لکشمی پرنسپل سکریٹری نے اپنے حکم نامہ میں کہا ہے کہ مشرقی ومغربی گوداوری اضلاع کے کلکٹروں نے باوا سماج، دہلی کی طرف سے بھیجے گئے خاکوں کو آگے بھیج دیا جس میں ایسے الفاظ پر اعتراض کیا گیا ہے جن سے نائی برہمن برادری کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ان لفظوں سے اس کمیونٹی کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔ بی سی ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر نے بھی اسی طرح کا خاکہ تحریر کیا جس پر حکومت نے غور کیا۔ اے پی نائی برہمن ویلفیئر کارپوریشن اور کاسٹ ایسوسی ایشنز نے اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا۔ اے پی این ڈبلیو سی کے چیئر مین سدا وتم یاناڈیا نے بدسلوکی کے الفاظ پر پابندی لگانے کے لیے حکومت کا شکریہ ادا کیا۔ ممبر آف دی اے پی نائی برہمن ویلفیئر فرنٹ نے کہا کہ سماجی اور اقتصادی ترقی کے باوجود نائی برہمن برادری کے لوگوں کو گالی گلوچ کے ساتھ توہین کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا، وارانسی ایڈیشن۔ ۱۳-۸-۲۲ء ص ۱۲)

ک، ص اصلاحی

تلخیص وترجمہ

اسلامی تصوف

کلیم صفات اصلاحی

ٹائمز آف انڈیا کا مشہور کالم "The Speaking Tree" (بولنے والا پیڑ) ہے۔اس کے تحت مختلف فکری وروحانی علوم وموضوعات پر کسی بڑے ادیب ودانشور کی سبق آموز اور دلچسپ تحریر شائع ہوتی ہے۔ گزشتہ مہینہ ۲۱ جون ۲۲ء کی اشاعت میں سمیت پال صاحب کی ایک تحریر "اسلامی تصوف" کے نام سے نظر سے گذری۔ مضمون نگار نے بنیادی طور پر تصوف کو کسی خاص مذہب یا فکر وفلسفہ میں محدود ہو کر سمجھنے کو غلط قرار دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ تصوف نہ ہندو ہے نہ مسلمان اور نہ عیسائی۔یہ ایک غیر مذہبی اور غیر مسلکی نظریہ ہے۔انہوں نے بڑی چالاکی سے اپنے اس خیال کا مصدر و مأخذ بعض مسلمان صوفیوں اور شاعروں کی تحریروں کو بنایا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہی اصل اسلامی تصوف ہے جو ان بزرگوں کے یہاں موجود ہے۔ حالانکہ اسلامی تصوف کی جو تعبیر وتشریح اور ترجمانی انہوں نے کی ہے اس کا تعلق مسلمان صوفیوں کے ذاتی خیالات اور ان کے اپنے باطنی مشاہدات وتجربات سے تو ہو سکتا ہے مگر اسلامی تصوف سے قطعاً نہیں۔قرآن نے جس چیز کو تزکیۂ نفوس اور زبان رسولؐ نے جس کو احسان سے تعبیر کیا ہے حقیقت میں اسلامی تصوف اسی کو کہتے ہیں۔اس کا مقصود اسلامی حدود میں رہتے ہوئے رضائے الٰہی کا حصول اور اس کے احکامات کی مکمل پابندی اور معرفت رب ہے۔اس کے علاوہ اس ضمن میں جو فلسفیانہ اقوال و نظریات پائے جاتے ہیں اس کی حیثیت اسلامی نہیں ہے۔اب سمت پال صاحب کے مضمون کا ترجمہ وخلاصہ ملاحظہ فرمائیں (مترجم)

کسی بھی فرد کو اس کی قدر وقیمت کا پتہ دے کر تصوف انسان کو خدائی کے اس درجہ تک بلند کر سکتا ہے جہاں سے چھوٹے پن (پستی) کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی[1]۔ فارسی صوفی خاقانی لکھتا ہے "ساری دنیا

۱۔ یہ تصور یقیناً غیر اسلامی اور عقیدۂ توحید کے سخت منافی ہے۔ایک صوفی خواہ اپنی ریاضت ومجاہدہ سے روحانیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام تک پہنچ جائے اس کو کبھی بھی کوئی شے یا نظریہ خدائی کے مقام تک نہیں پہنچا سکتا۔اس کی ترقی خدا کے سامنے بندگی اور عجز وفروتنی کی انتہا تک پہنچنے میں ہے۔علامہ اقبال سہیل نے خدا اور اس کے حقیقی مقام ومرتبہ کے متعلق اپنے شعر میں نہایت صحیح بات کہی ہے،اس سے خدا اور بندہ کے مابین حدود کا

ایک بڑا مزار ہے۔ایک مزار کے اندر اتنے مزاروں کی کیا ضرورت ہے؟۔"اس کا یہ اقتباس ویرانی و پستی کے صحرا میں تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوتا ہے۔سب سے پہلے تصوف نہ اسلامی ہے،نہ ہندو اور نہ عیسائی ہے۔یہ (شاہراہ) غیر مذہبی اور غیر مسلکی ہے۔ہم اسلامی تصوف کی اصطلاح آسانی کے خیال سے استعمال کرتے ہیں۔تصوف عالم گیر ہے۔اس کا اثر و نفوذ کائنات کے ہر ذرہ میں موجود ہے۔اردو کے مشہور شاعر اکبر الٰہ آبادی نے مختصراً یہ کہا ہے۔

ہر ذرہ چمکتا ہے انوار الٰہی سے
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

ہر ذرہ اللہ تعالیٰ کے نور سے تابناک ہے۔ہر سانس کہتی ہے۔اگر میں موجود ہوں تو خدا ہے۔یہ روحانیت اور تصوف کا وہ جوہر ہے جو مذہب کے تنگ دائروں اور عبادت گاہوں تک محدود نہیں۔ فارسی کے برطانوی اسکالر رینالڈ اے نکلسن کے بہ قول "یہ ذاتی طور پر ذاتی ہے"۔اسلامی تصوف کا خلاصہ جلال الدین رومی بلخی کی تصنیف میں پایا جا سکتا ہے جنھوں نے سب کو خوش آمدید کہا ہے۔خواہ وہ کافر ہو یا مؤمن، آتش پرست ہو یا کافر۔علامہ اقبال کے الفاظ میں ہر روح ایک آفاقی روح کی بار بردار ہے اور اس میں ایک جیسی صفات پائی جاتی ہیں۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی،خاکی ہو یا ناری
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

ہر چیز کی بنیادی حقیقت ایک ہی ہے۔ذرہ کا دل اگر کاٹ دیا جائے تو سورج کا خون بہے گا۔اپنیشدوں اور ویدانتک فلسفہ سے متاثر ہو کر ایرانی صوفی انسان کے عمودی ارتقا پر یقین رکھتے تھے۔جب انسان عمودی طور پر ترقی کرتے ہیں تو وہ خدائی تک پہنچ جاتے ہیں اور اپنے اندر موجود الوہیت سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔جیسا کہ رومی نے کہا ہے کہ ہر کسی کی زندگی میں ایک موڑ آتا ہے جب وہ ایک بت پرست یا مسلمان ہونے سے آگے بڑھتا ہے جو غیر مشکل (تصور سے ماورا) خدا کی عبادت کرتا ہے۔دوسرے لفظوں میں انسانیت کے خالص جوہر کو حاصل کرنا الوہیت ہے۔ہر فرد یکساں طور پر محترم اور حقیقی ہے۔ہر حقیقی روح آفاقی روح کے ساتھ مل جاتی ہے۔اپنیشدک سوتر کے اعلان کے مطابق "اہم برہما" یا اسلامی تصوف میں "انا الحق" روحانیت کا یہ وہی مقام ہے۔حقیقی تصوف ترک

انداز کیا جا سکتا ہے۔کہتے ہیں: جو تصور سے ماورا نہ ہوا —— وہ تو بندہ ہوا خدا نہ ہوا (مترجم)

دنیا یا سنیاس نہیں ہے۔ وہ ایک دنیاوی وجود ہے اور اپنی الوہیت (کی بقا) کے لیے زندہ رہتا ہے۔ تصوف کوئی مستثنیٰ فلسفہ یا خوش نما نظریہ نہیں ہے۔ یہ انسانی فطرت کی شگفتگی ہے۔ اپنی ذات کا ارتقا اور فطرت الٰہی کا ادراک ہے۔ ایک صوفی تمام انسانیت کی فتح کا جشن مناتا ہے اور ہر انسان کے درد، حالت زار اور مصیبت میں ہمدردی کرتا ہے۔ انسان دیوتا (یعنی لائق پرستش) ہے اور باقی غیر اہم ہیں۔ ہر اس صوفی کا قول ہے جو پوری بنی نوع انسان سے تعلق رکھتا ہے۔ قبولیت سے بھرا ایک صوفی کا دل جو ہمت اور یکسوئی کے ساتھ سب کا خیر مقدم کرتا ہے۔ مساوات پرستی تصوف کی جڑ ہے۔ ایک صوفی دنیا میں موجود ہے پھر بھی وہ اس میں شامل نہیں ہے۔ وہ ایک غیر متعصب مشاہد و مبصر ہے۔ جیسا کہ اکبر الٰہ آبادی کہتے ہیں۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں

اگرچہ میں دنیا میں ہوں، میں اس کا خواہش مند نہیں ہوں۔ میں اس بازار سے گذرا ہوں جسے دنیا کہا جاتا ہے، میں خریدار نہیں ہوں۔ آج اس آفاقی محبت کو یاد رکھنا سمجھ داری کی بات ہے جو صوفیوں کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ جنھوں نے زندہ اور بے جان تمام چیزوں میں کھلے طور پر اس کا مشاہدہ کیا تھا۔ ہر وجود کے چیتنا، شعور کو چھونا اور اس سے فوری طور پر جڑنا تصوف کا کائناتی مقصد ہے۔ ایک فرد کو اس کی قدر و منزلت کا اندازہ لگا کر تصوف انسان کو خدا کے درجہ تک بلند کرتا ہے اور اس کے لیے چھوٹے پن (پستی) کی کوئی گنجائش (جگہ) نہیں چھوڑتا جس کا مشاہدہ ہم آئے دن کرتے رہتے ہیں۔ تصوف انسان کے بنائے ہوئے مذہب کے تمام دکھاوے اور اظہار سے بالاتر ہے۔ شکیل بدایونی کے یہ قول

پہنچا ہوں وہاں، نہیں دور جہاں، بھگوان بھی میری نگاہ سے

میں اس بلندی پر پہنچ گیا ہوں جہاں خدا بھی میری نظروں سے دور نہیں ہے۔ یہی تصوف کی روح ہے۔
(ماخوذ از: ٹائمز آف انڈیا، وارانسی ایڈیشن ۲۱ جون ۲۲ء ص ۱۴)

جہانگیری سکے کی پھر سے تلاش شروع

دنیا کے سب سے بڑے گم شدہ سونے کے جہانگیری سکہ کے متعلق یہ مختصر تحریر بھی ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوئی ہے جو سکوں کی تاریخ پر خاص تحقیق کرنے والی پروفیسر سلمیٰ صاحبہ کے ایک

حالیہ انٹرویو اور نئی معلومات پر مشتمل ہے۔اس کی تلخیص قارئین معارف کی نذر کی جاتی ہے (مترجم)۔

دنیا کے سب سے بڑے ۱۲ کلو گرام سونے کے سکہ کی تقریباً چار دہائیوں کی بے سود تلاش کے بعد مرکزی حکومت نے پھر سے تلاش شروع کی ہے۔اسے آخری بار نظام حیدرآباد مکرم جاہ کے قبضے میں اس وقت دیکھا گیا تھا جب انہوں نے سکہ کو نیلام کرنے کی کوشش کی تھی۔ہندوستان کی سی بی آئی اس سکے کو تلاش کرنے میں ناکام رہی۔مکرم جاہ کو یہ سکہ ان کے دادا اور حیدرآباد کے آخری نظام میر عثمان علی خان کے ذریعہ ملا تھا۔آخری نظام کو شہنشاہ جہانگیر کا بنایا ہوا سکہ وراثت میں ملا تھا۔ممتاز مؤرخہ پروفیسر سلمیٰ احمد فاروقی (ایچ کے شیر وانی سینٹر فار دکن اسٹڈیز مولانا آزاد اردو نیشنل یونیورسٹی)، جنہوں نے دنیا کے سب سے بڑے سکوں کی تاریخ اور وراثت پر تحقیق کی ہے، نے کہا کہ یہ انمول اور حیدرآباد کا فخر ہے۔اب ۳۵ سال بعد سکے کو تلاش کرنے کی مہم پھر سے شروع کی گئی ہے۔۱۹۸۷ء میں جب یورپ میں ہندوستانی عہدیداروں نے مرکزی حکومت کو مشہور نیلامی کرنے والے ہیس برگ فیلڈ مین SA کے بارے میں آگاہ کیا جس کے ذریعہ ۹ نومبر کو موگا ہوٹل، جنیوا میں 11.953,8 کلو گرام سونے کا سکہ پیرس میں واقع انڈویز بینک کی جنیوا شاخ کے ذریعے نیلام کیا گیا۔اس وقت سے سی بی آئی تصویر میں آگئی۔ تحقیقات شروع ہوئیں اور بہت سی معلومات سامنے آئیں۔پروفیسر سلمیٰ نے ٹائمز آف انڈیا کو بتایا کہ سی بی آئی کے بہت سے اہل کار جو تحقیقات کا حصہ تھے اب دفتر میں نہیں ہیں۔اس لیے تلاش بے نتیجہ رہی۔سی بی آئی کے سابق جوائنٹ ڈائریکٹر شانتو مین نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ سی بی آئی حکام کو پتہ چلا ہے کہ جہانگیر نے اس طرح کے دو سکے تیار کرائے تھے۔ایک شاہ ایران کے سفیر یادگار علی کو پیش کیا گیا تھا۔دوسرا حیدرآباد کے نظاموں کی ملکیت بن گیا تھا۔سلمیٰ نے کہا کہ سی بی آئی کی اسپیشل انویسٹی گیشن یونٹ X1 کی سربراہی میں ایک سپرنٹنڈنٹ رینک کے افسر نے ۱۹۸۷ء میں اینٹیک اینڈ آرٹ ٹریژرز ایکٹ ۱۹۷۲ء کے تحت تفتیش کی اور ایف آئی آر بھی درج کی گئی۔مزید تحقیقات سے معلوم ہوا کہ مکرم جاہ ۱۹۸۷ء میں سوئس نیلامی میں سونے کے دو مہر نیلام کرنے کی کوشش کر رہے تھے جن میں سے ایک قیاساً ایک ہزار تولہ کا سکہ تھا۔۱۹۸۱ء میں اس کی قیمت ۱۶ ملین ڈالر تھی۔یہ بتاتے ہوئے کہ کئی سال گذر چکے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ جہانگیر کی طرف سے بنائے گئے اس سکہ کا کیا ہوا؟ جو سوئس نیلام گھر میں آیا تھا۔انہوں نے امید ظاہر کی کہ اس بار مرکز کی طرف سے نئی کوششوں کا مثبت نتیجہ

نکل سکتا ہے (ٹائمز آف انڈیا وارانسی ایڈیشن ۲۸ جون ۲۲ ص ۶)۔

سندان کی سلطنت ماہانیہ

(د۔ محمد حسن محمد امام الباشا، الامارۃ الماھانیۃ فی السندان (۱۹۸۔۲۲۷ھ/۸۱۳۔۸۴۱م، مجلۃ آفاق الثقافہ والتراث، دبی، جون ۲۰۲۲، ص ۵۸۔۹۰)

محمد بن القاسم (م: ۹۶ھ/۷۱۴ء) کی اوائل اسلام میں فتح سند کے بعد شمالی مشرقی ہندوستان میں متعدد اسلامی سلطنتیں قائم ہوئیں جن کے بارے میں بہت تفصیلات نہیں ملتی ہیں۔ انہی میں سے ایک سلطنت ماھانیہ بھی ہے جو سندان میں نویں صدی عیسوی کے نصف اول میں قائم ہوئی۔ یہ ہندوستان میں پہلی آزاد اسلامی مملکت تھی جو خلافت عباسیہ کے تابع نہیں تھی۔ اس کو قائم کرنے والا الفضل بن ماھان قبیلہ بنو سامۃ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ قبیلہ خلافت عباسیہ سے الگ اپنی سلطنت قائم کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ الفضل بن ماہان والیٔ سندھ موسی بن یحیی البرمکی (۲۱۶۔۲۲۱ھ/۸۳۱۔۸۳۵ء) کے زمانے میں سندھ کے ایک علاقے کا گورنر تھا۔ الفضل نے ایک فوج کے ساتھ سوراشٹر میں واقع سندان پر حملہ کرکے اس کو فتح کر لیا اور وہاں ایک آزاد اسلامی حکومت قائم کرلی۔ سندان دیبل اور منصورہ سے دس مرحلے [1] کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ علاقہ بحری قزاقوں کا گڑھ تھا۔

حکومت قائم کرنے کے بعد الفضل نے عباسی خلیفہ المامون کو تحفے بھیجے، ان سے خط و کتابت کی اور مسجد میں ان کے لئے دعا کا اہتمام کرایا۔ اس کا ذکر بلاذری نے فتوح البلدان میں کیا ہے۔ لیکن بلاذری نے سندان کو فتح کرنے کی لڑائی کی تفصیلات نہیں بیان کی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی خاص لڑائی کے بغیر یہ فتح عمل میں آئی تھی اور مسلمانوں کے مقامی لوگوں سے تعلقات اچھے تھے۔

الفضل کے بعد اس سلطنت پر اس کے بیٹے محمد بن الفضل نے حکومت کی اور اس کے بعد اس کے دوسرے بیٹے ماھان بن الفضل نے حکومت کی۔ محمد بن الفضل نے سلطنت کی حدود میں توسیع کی

---

[1] ''مرحلۃ'' مسافت ناپنے کا قدیم عربی معیار ہے۔ ایک ''مرحلۃ'' اتنی مسافت ہے جو ایک پیدل آدمی یا ایک جانور چل کر ایک دن میں قطع کرلے۔ بالعموم ایک مرحلہ ۲۴ میل کے برابر ہے لیکن فقہ حنفی اور مالکی میں ایک مرحلۃ ۴۴٫۵۲۰ کیلو میٹر اور فقہ حنبلی اور شافعی میں ایک مرحلۃ ۸۹٫۰۴ کیلو میٹر کے برابر ہے۔

اور ۷۰ء کشتیوں پر مشتمل ایک بحری بیڑا تیار کیا تاکہ بحری قزاقوں کا خاتمہ کیا جاسکے۔ ماہان بن الفضل کے خلاف مقامی لوگوں نے بغاوت کی اور اسے قتل کر دیا۔ یوں ۲۹ء سال قائم رہنے کے بعد یہ سلطنت خلیفۃ المعتصم باللہ کے زمانے میں سنہ ۲۲۷ھ/۸۴۱ء میں ختم ہوگئی۔ مقامی لوگوں نے وہاں پر بسے مسلمانوں سے تعرض نہیں کیا بلکہ ان کو اپنے دینی شعائر ادا کرنے کی اجازت دی اور مسجد کو حسب سابق قائم رکھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگوں کو عام مسلمانوں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ مضمون نگار نے اس زمانے کی سلطنت ماہانیہ کی ثقافتی، تجارتی اور زراعتی احوال سے بھی بحث کی ہے (تلخیص: ڈاکٹر ظفر الاسلام خان)۔

تبصرۂ کتب

تاریخ شعر وادب شمالی آرکاٹ:

ڈاکٹر جاویدہ حبیب ۔ کاغذ وطباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات :۳۵۴ ملنے کا پتہ : مصنف اردو لکچرر اسلامک ریسرچ سنٹر نمبر:۵۴ کے،بی ،ڈسن روڈ تیناپٹ، چینئی۔۶۰۰۰۱۸۔ قیمت ۲۱۴ روپے۔ سن طباعت :۲۰۱۹ء۔ موبائل نمبر: ۹۸۸۴۳۳۷۲۱۴۔

جنوبی ہند میں ٹمل ناڈو کی سرزمین اردو زبان وادب اور شعر وشاعری کے لیے شروع سے زرخیز رہی ہے۔ اس علاقہ کی اردو تاریخ پر اس سے قبل مستقل کتابیں اور درجنوں مضامین منظر عام پر آچکے ہیں۔ خود مصنفہ نے آرکاٹ، ویلور اور وشارم میں اردو شاعری ؛تاریخ ادب اردو ٹمل ناڈ، شمالی آرکاٹ میں اردو اور ٹمل ناڈ میں اردو غزل کی نئی پرانی سمتیں تصنیف کر کے اس علاقہ کے لوگوں کی اردو زبان وادب سے دلچسپی کے نمونے پیش کر چکی ہیں لیکن خاص شمالی آرکاٹ کے شعرا وادبا کی علمی وادبی سرگرمیوں پر اب تک اس قدر وسیع ووقیع اور تحقیقی کام نہیں کیا گیا تھا۔ زیر تبصرہ کتاب کی مصنفہ کا تعلق اسی علاقہ سے ہے اور وہ علیم صبانویدی صاحب کی لخت جگر ہیں۔ تحقیق وتنقید اور تصنیف وتالیف کا سلیقہ انہیں ورثہ میں ملا ہے۔ والد کے تصنیفی وتحقیقی کاموں کی ترتیب میں تعاون اور دلچسپی نے ان کی علمی لیاقت اور تصنیفی صلاحیت میں مزید جلا بخشا اور اب تو وہ متعدد کتابیں تصنیف کر کے جنوب میں اردو کی دنیائے علم وادب کا معتبر نام بن چکی ہیں۔

زیر نظر تصنیف میں مصنفہ نے پہلے جنوبی ہند میں اردو کے عنوان سے اردو کی نشو نما اور عہد بہ عہد اس کے ارتقا پر گفتگو کی ہے۔ (ص ۹ تا ۱۶) اور غالباً ان کا یہی مضمون کتاب کے پیش لفظ کے طور پر شامل ہے۔ حالانکہ اس کو پیش لفظ یا مقدمہ کا نام نہیں دیا گیا ہے۔ مصنفہ کو اردو کے ساتھ شمالی ہند کے لوگوں کے معاندانہ رویہ کا شدید احساس ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ”ایک موقع ایسا آیا کہ شمالی ہند کے لوگ دکھن اور جنوب ہند کو اردو سے غیر مانوس علاقہ سمجھنے لگے۔۔۔ حالانکہ روز اول سے جنوب اردو سے مانوس ہے۔“ (ص ۱۶) لیکن انہوں نے اس الزام کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ اسی طرح ان کا یہ خیال بھی اہم اور منفرد ہے کہ اس علاقہ میں باقاعدہ ادبی روپ میں اردو اوائل دسویں صدی ہجری سے ملتی ہے اور اولین شاعروں اور نثر نگاروں میں شاہ سلطان ثانی کا نام آتا ہے۔ (ص ۱۸) اس کے بعد شمالی آرکاٹ کے شعر وادب کا پس منظر، دبستان آرکاٹ کا تاریخی، سماجی اور ادبی پس منظر دکھایا ہے۔ پھر آرکاٹ، ویلور، وشارم، آمبور، وانمباڑی،

عمرآباد، پرنام پیٹ، گڑیاتم، پلی گنڈا، ترپانور کے تاریخی اور جغرافیائی پس منظر اور وہاں کے تقریباً پونے دوسو اہم ترین اور ممتاز شعرا وادبا کی شعری وادبی سرگرمیوں کا حسب ضرورت مفصل اور مختصر تذکرہ لکھا ہے۔ اس میں بعض شاعرات اثیمہ آرکاٹی، تبسم رشید اور نعیمہ پرویز وغیرہ کے نام بھی شامل ہیں۔اس کے بعد مدارس میں خواتین کی اہمیت اور خدمات کے مرکزی عنوان کے تحت شمالی آرکاٹ میں عربی ودینی مدارس اور بعض تنظیموں کے قیام اور ان کی خدمات کا جائزہ اس مقصد سے پیش کیا ہے کہ اس سے اردو زبان وادب کی جڑیں اس علاقہ میں مضبوط ہوئی ہیں (ص ۲۶۵ تا ۲۷۲)۔اس کے بعد شمالی آرکاٹ میں بیرونی علاقوں کے ادبا وشعرا اور آخر میں دارالعلوم باقیات الصالحات اور دارالعلوم لطیفیہ سے وابستہ شخصیات کی علمی، ادبی اور دینی خدمات کا الگ سے جائزہ پیش کیا ہے۔ بعض شعرا وادبا مثلاً الطاف شاداب (ص ۱۸۸) سراج زیبائی (ص ۱۹۱) مشتاق رفیقی (۱۹۳) وغیرہ کے مطبوعہ تذکرے علیم صبانویدی کے قلم سے ہیں۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مصنفہ نے چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے چنے ہیں۔ کتاب میں ایسے درجنوں شعرا کے ادبی تذکرے لکھے ہیں جن کے نام و کلام سے شمالی ہند کے لوگوں کو پہلی بار واقف اور مستفید ہونے کا موقع ملا ہے۔اس سے شمالی آرکاٹ کے قدیم شعری وادبی کارناموں کے بعض پہلو سامنے آتے ہیں۔ معلومات کے احاطہ میں بہت حد تک باریک بینی سے کام لیا ہے، پیشکش کا اسلوب بھی دلنشین اور ادبی متانت کا حامل ہے۔اس لحاظ سے یہ ایک قابل قدر کتاب ہے۔ محبان اردو کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

ممتاز ترین شعرا کی فہرست میں ندیم اللہ ندیم اور معجز آرکاٹی جیسے متعدد شعرا ہیں جن کے متعلق صرف دو یا تین سطریں لکھی گئی ہیں۔ان کا کوئی شعر نقل نہیں ہوا ہے۔ ظاہر ہے اس سے ان کے شاعرانہ امتیازات کا اندازہ قاری کو کیوں کر ہوگا؟ حروف کا پوائنٹ سائز اس قدر کم ہے کہ ضعیف البصر افراد کو عبارتوں سے شدید مزاحمت کرنی پڑے گی۔ اسی طرح ابہام گوئی (ص ۱۲،۱۳) مححقیقین (ص ۵۶)، باندھی (۵۶) وغیرہ جیسی املائی غلطیوں کی جانب توجہ کی ضرورت تھی۔ لیکن ان معمولی فروگذاشتوں کی وجہ سے کتاب کی اہمیت وافادیت اور اس کی تحقیقی عظمت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا۔ **ک۔ ص اصلاحی**

مشرقی علوم اور کلاسی فیکیشن:

از مولانا عبدالرحمن خالد فلاحی۔ متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۰۸، ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، نزد جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ۔ قیمت: ۶۷ روپے۔ سن اشاعت: ۲۰۲۰ء۔ رابطہ فون نمبر:

Email : arkhalid03@gmail.com ۸۰۰۹۵۰۹۹۲۸

کتابوں سے دلچسپی کے لیے ان کو خریدنا، پڑھنا، جمع کرنا اور پھر ان کی حفاظت کرنا یہ سارے عمل ضروری ہیں اور صدیوں سے کتابوں کا ذوق و شوق ان ہی عملیات کے سایہ میں پروان چڑھتا رہا ہے۔ الکتاب کے نزول کے بعد کا زمانہ علم اور کتاب کے فروغ سے عبارت ہے، جس نے ضرورت کے تحت کتاب داری کا فن ایجاد کیا، کتابوں کی کثرت نے انسانی معاشرہ کی طرح کتابوں کی درجہ بندی کی اہمیت ظاہر کی، درجہ بندی کے اظہار کے لیے اس فن میں اعداد کی مدد لی گئی، کتاب داری فن کے مقام سے گزر کر ایک علم کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ یعنی جس درجہ بندی کی بنیاد الفہرست والے الندیم نے رکھی تھی، اسی پر منزلوں پر منزلیں تعمیر ہوتی گئیں۔ اصطلاحات کی جگہ اعداد نے لی اور اب علم و فن کتاب داری میں اسی طریقہ ترتیب کو عام قبولیت حاصل ہے، مگر ہمارے مشرقی قدیم کتب خانوں کا اپنا ایک جدا نظام قائم رہا، یہاں علوم و فنون کی تقسیم کے لحاظ سے کتابوں کی الماریاں اپنے وجود کا اعلان کرتی رہیں، ان قدیم خزانوں کے رکھوالے جدید کتب داری کے فن سے روشناس کرانے والے میلول ڈیوی اور ان کے عہد کے کچھ اور لوگوں کے نام ہی سے واقف نہیں تھے۔ واقفیت تو آسان تھی لیکن ان کے فنی نکات کو سمجھنا واقعی آسان نہیں تھا۔ اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے انتخاب جس کا ہوا وہ ایک دینی درس گاہ کا طالب علم ہی تھا، مگر شوق دلچسپی نے راستہ ہموار کیا اور اب وہ جامعۃ الفلاح کے ناظر کتب خانہ ہیں، انھوں نے جدید اصول و ضوابط کی نافعیت جس طرح جامعہ کے کتب خانہ میں منتقل کی اس کے لیے ایک صاحب نظر ڈاکٹر نعیم حامد علی الحامد کا یہ اعتراف ہی کافی ہے کہ انھوں نے عالمی کتب خانے دیکھے لیکن جامعۃ الفلاح کے کتب خانہ کی سی ترتیب کہیں اور نظر نہیں آئی۔ پیش نظر مختصر سی کتاب اسی اعتراف کی گویا گواہی ہے جس میں لائق مرتب نے میلول ڈیوی Melvil Dewey کی درجہ بندی پر گفتگو کی، ڈیوی کی جدول سازی، عشری درجہ بندی وغیرہ موضوعات پر مفید معلومات کے ساتھ اسلام اور دیگر مذاہب کے متعلق مشرقی علوم و فنون کی کتابوں کے اعداد پیش کیے۔ یکساں اور غیر یکساں موضوعات کی بنیاد پر ترتیب اور اعداد، جیسے پہلوؤں کو عملی طور پر انھوں نے بڑی مہارت اور بڑی خوبی سے آسان بنا دیا۔ اپنے فن پر یہ کتاب حد درجہ مفید اور اسی طرح منفرد بھی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے اور اس سے پہلے اور بعد لائق مرتب کی محنت داد اور اس کی قبولیت کی دعا بھی کرنا چاہیے۔ ع۔ ص

ادبیات

نعت نبی ﷺ

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

نعمانی منزل مکان نمبر ۴/۷۰۴ ج۔ ۲۴، نزد ابوہریرہ مسجد، ہمدرد نگر۔بی، جمال پور۔ علیگڑھ ۲۰۲۰۰۲

موبائل: 9897820777

ڈھونڈنے والے تھک گئے ڈھونڈ کر شش جہات میں

کوئی نہ پایا آپ ﷺ سا، عالم ممکنات میں

جنبشِ چشم پاک سے ، رحمتیں جلوہ ریز تھیں

حکمتوں کے خزینے تھے آپ ﷺ کی بات بات میں

آج تک اس مقام پر ذہنِ بشر نہ جاسکا

آپ ﷺ گئے تھے جس جگہ ایک سہانی رات میں

شرک ہے ،عینِ حق کہے یا کہے کوئی مثلِ حق

گرچہ ہے نارسا زباں ، آپ ﷺ کی مدحیات میں

لیں خبر اپنے دین کی ، کرتے نہیں ہیں فرق جو

ذاتِ رسولِ پاک ﷺ میں اور خدا کی ذات میں

گرچہ نہیں جہاں میں اب کوئی بھی خالدؓ و عمرؓ

پھر بھی ہے ایک خوف سا بزم منات و لات میں

صدیاں ہوئیں گزر چکی، وقت کے سر سے موج خوں

ڈھونڈتے کیا ہو اب میاں ، خاکِ لبِ فرات میں

نعتِ رسول ﷺ اور ہے ، شاعری ہے کچھ اور شے

ناقدو ! فرق ہے بہت ، اصل و تخیلات میں

حمد سے اور نعت سے دل کو ہے ایک ربط خاص

کس لیے شک ہو پھر رئیس اپنی مجھے نجات میں

معارف کی ڈاک

(۱)

برصغیر کے تذکروں کی تاریخ

معارف کے دو تین شماروں سے مستقل محترم جناب عارف نوشاہی کے افادات سے مستفید ہو رہا ہوں۔جناب موصوف کی برصغیر کے تذکروں اور فارسی ادبیات کی تاریخ پر جو نظر ہے وہ اہل علم سے کسی طرح مخفی نہیں۔میں معارف ہی کے ذریعہ ان کی خدمت میں چند سوالات پیش کرنا چاہتا ہوں،امید ہے کہ جواب سے محروم نہ رکھیں گے،سب سے پہلے تو موصوف سے گذارش کرتا ہوں کہ اگر ان کے قلم سے برصغیر کے تذکروں کی تاریخ پر تحقیق منظر عام پر آئے،کہ ان سے بہتر یہ کام کوئی اور نہیں انجام دے سکتا۔

پھر ان سے یہ معلوم کرنا تھا کہ برصغیر میں خاص کسی علاقہ کی تاریخ یا تذکرہ پر سب سے پہلے کون سی کتاب لکھی گئی،فارسی میں بھی اور اردو میں بھی۔آزاد بلگرامی کی مآثر الکرام جس طرح ایک علاقہ کا اہم تذکرہ ہے اس طرح کی اولین کوشش کون سی ہے۔

دوسرے مجھے ظہرت نامہ نامی ایک کتاب کی تفصیلات مطلوب ہیں،اس کتاب کا نام تو جگہ جگہ ملتا ہے لیکن اس کے مصنف کا نام اور دیگر تفصیلات کا علم اب تک باوجود تلاش و تحقیق کے نہیں ہو سکا،نہ اس کے کسی نسخہ کا سراغ لگ سکا۔

طلحہ نعمت ندوی
talhanemat3@gmail.com

(۲)

مولانا امین احسن اصلاحی اور ان کی تفسیر تدبر قرآن

مئی ۲۰۲۲ء کے معارف میں ایک مضمون ''مولانا امین احسن اصلاحی اور ان کی تفسیر تدبر قرآن'' (عبدالمنان چیمہ،ریسرچ اسکالر،سرگودھا،پاکستان) شائع ہوا ہے۔اس میں درج ذیل باتیں محل نظر معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ ۔۔پیدا ہوئے۔مولانا شبلی نعمانی بھی اسی خاندان کے چشم وچراغ

تھے۔(ص ۳۴۷،۳۴۷،۳۴۷)

۲۔ ”یہ تصنیف محاسن و معائب کا بہترین نمونہ ہے۔“(صفحہ ص ۳۸۰)

۳۔ ”اس میں احادیث، مجتہدین اور دوسرے مفسرین کے اقوال سے صرف نظر کیا گیا ہے“ (حوالہ سابق)۔ پہلی بات یہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانیؒ مولانا فراہیؒ کے ماموں زاد بھائی ضرور تھے ،لیکن دونوں میں خاندانی تعلق نہیں، بلکہ رشتہ داری کا تعلق تھا۔ مولانا شبلی راجپوت تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ شیوراج سنگھ اسلام قبول کرکے سراج الدین ہوئے، یعنی آج سے تقریباً پانچ سو برس پہلے وہ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے (علامہ اقبال احمد خان سہیل، سیرت شبلی، مرتبہ فضل الرحمن اصلاحی، ۲۰۱۴ء، ص ۷،)؛ جبکہ مولانا فراہیؒ کے مورث اعلی شیخ بہاءالدین ہیں، جو عرب سے سکندر لودھی کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ذکر فراہی، ۲۰۰۱ء، ص ۲۵۔۲۶)۔

دوسری بات یہ ہے کہ کوئی تصنیف بہترین محاسن و معائب کا مجموعہ کیسے ہو سکتی ہے؟۔ یہ تعبیر محل نظر معلوم ہوتی ہے۔ یا تو اس میں محاسن ہوں گے یا پھر معائب، دونوں کا مجموعہ، وہ بھی بہترین؟

تیسری بات یہ کہ مولانا اصلاحیؒ پر ایک حلقے میں جو استخفاف احادیث کا الزام لگایا جاتا ہے، وہ قطعی درست نہیں ہے۔ انھوں نے بخاری مسلم اور موطا جیسی اہم کتب حدیث کا باقاعدہ درس دیا اور ان میں بہت سی چیزیں اب کتابی صورت میں چھپ کر عام بھی ہو گئی ہیں۔ نیز مولانا اصلاحی نے تدبر قرآن لکھنے سے قبل ”مبادیء تدبر حدیث جیسی اہم کتاب لکھی۔ انہوں نے فن حدیث ،ماہر فن، صاحب تحفۃ الاحوذی مولانا عبدالرحمن مبارک پوریؒ جیسے عظیم محدث سے پڑھی تھی ۔ان کی خدمات حدیث کو جاننے کے لئے مولانا خالد مسعودؒ کا مضمون ”مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمت حدیث“ کا مطالعہ مفید ہوگا (علوم القرآن مولانا امین اصلاحی جنوری تا دسمبر ۲۰۰۰ء)۔

مولانا اصلاحی نے تدبر قرآن میں احادیث صحیحہ کے علاوہ سنت متواترہ سے بھی مکمل استفادہ کیا ہے۔ جیسا کہ مقدمہ تدبر قرآن جلد اول میں لکھتے ہیں: ”جہاں تک قرآن مجید کی اصطلاحات کا تعلق ہے۔۔۔۔ان کی تفسیریں میں نے سو فیصد سنت متواترہ کی روشنی میں کی ہے“(تدبر قرآن جلد اول صفحہ ع)۔

نیز آگے احادیث و آثار صحابہ کے ذیلی عنوان کے تحت حدیث کے مقام واہمیت کو یوں اجاگر کرتے تحریر کرتے ہیں:

> تفسیر کے ظنی مأخذوں میں سب سے اشرف اور سب سے زیادہ پاکیزہ چیز ذخیرۂ احادیث و آثار ہے۔ اگر ان کی صحت کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہوتا تو تفسیر میں اس کی وہی اہمیت ہوتی جو اہمیت سنت متواترہ کی بیان ہوئی۔۔۔میں نے صرف ان ہی احادیث تک استفادے کو محدود نہیں رکھا ہے، جو قرآن کی کسی آیت کی صراحت کے ساتھ وارد ہوئی ہیں، بلکہ پورے ذخیرۂ احادیث سے اپنے امکان کی حد تک فائدہ اٹھایا ہے۔ خاص طور پر حکمت قرآن کے مسائل میں جو مدد مجھے احادیث سے ملی ہے۔ وہ کسی بھی دوسری چیز سے نہیں ملی۔ اگر کوئی حدیث مجھے ایسی ملی ہے جو قرآن سے متصادم نظر آئی ہے تو ایک عرصے تک توقف کیا ہے۔ (حوالہ سابق صفحہ ف، ص)

اس موقع پر مبادئ تدبر حدیث کا ''خلاصہ بحث'' لائق استفادہ ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (ص ۷۵)۔ رہی بات یہ کہ اس میں مجتہدین اور دوسرے مفسرین کے اقوال سے صرف نظر کیا گیا ہے تو عرض یہ کہ مولانا اصلاحی نے مقدمہ تدبر قرآن جلد اول میں ''کتب تفسیر'' ایک ذیلی سرخی قائم کی ہے۔ اس میں کون سی تفسیریں مولانا اصلاحی کے پیش نظر رہی ہیں، اس کی وضاحت موجود ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> تفسیر کی کتابوں میں سے تین تفسیریں بالعموم میرے پیش نظر رہی ہیں۔ تفسیر ابن جریرؒ، تفسیر رازیؒ، تفسیر زمخشریؒ۔۔۔ یوں تو یہ تفسیریں میرے فکر و مطالعہ کی زندگی کے آغاز ہی سے میرے پیش نظر رہی ہیں، لیکن لکھتے وقت خاص طور پر میں نے اس پر ایک نظر ضرور ڈال لی ہے۔ (حوالہ سابق صفحہ ق)

ان تفسیروں کے علاوہ بھی دیگر تفسیروں سے مولانا اصلاحیؒ نے حسب موقع استفادہ کیا ہے جیسا کہ مولانا اصلاحی نے مقدمہ تدبر قرآن میں تفصیل کی ہے۔ اسی طرح اس ضمن میں مولانا سلطان احمد اصلاحی مرحوم کا مضمون ''تفسیر اصلاحی کے غیر فراہی عناصر کا مطالعہ'' بھی مفید ہوگا۔ (علوم القرآن، علی گڈھ، (مولانا امین اصلاحیؒ نمبر)۔

فضل الرحمن اصلاحی
islahi1980@gmail.com

(۳)

علمی رہنمائی کی گذارش

مجھے دو کتابوں کی ایک عرصہ سے تلاش ہے، اہل علم وذوق رہنمائی فرمائیں، عنایت ہوگی:

۱۔ تواریخ ضلع مظفر نگر، تالیف مولانا ڈپٹی نصر اللہ خاں خویشگی (مولانا خویشگی، عربی زبان وادب کے بہت بڑے عالم، پچیس تیس کتابوں کے مصنف، کئی زبانوں کے ماہر، ڈپٹی نذیر احمد کے خاص استاد اور اردو شعراء پر معروف تالیف، تذکرہ ہمیشہ بہار، کے مصنف تھے) نے جو اس وقت ضلع مظفر نگر میں ڈپٹی کلکٹر تھے، انگریز گورنمنٹ کی ہدایت پر ضلع مظفر نگر کی تاریخ لکھی تھی۔ اس وقت انگریز حکومت نے، صوبہ متحدہ، یوپی کے چند خاص اضلاع کی مفصل تاریخیں لکھوائی تھیں، جس میں مظفر نگر ضلع کی تاریخ غالباً سب سے مفصل تھی، جو چار جلدوں میں، غالباً ۷۲۔۱۸۷۱ء میں چھپی تھی، مگر ہزار کوشش کے باوجود، مجھے اس کے کسی مطبوعہ نسخہ کا سراغ نہیں ملا، اگر کسی ذاتی یا قومی ذخیرہ میں اس کا کوئی نسخہ ہو تو مطلع فرمایئے۔

۲۔ ایک کتاب اورنگ زیب عالم گیر کے احوال اور اس وقت کی ہندوستان کی معاشی، معاشرتی، سماجی زندگی پر ہے، جو کم سے کم آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔ اس کے ۷۵۳ سے ۷۸۴ تک صفحات میرے پاس ہیں۔ یہ کتاب کرنل ہملٹن کے سفر نامہ کی گویا شرح ہے۔ اس کا مصنف امیٹھی کا رہنے والا تھا، یہ کتاب ۱۳۴۲ھ (۱۹۲۴ء) کے بعد کی تالیف ہے۔ اس کا کیا نام ہے، اس کے مصنف کون تھے اور کہاں سے شائع ہوئی تھی، مطلع فرمایا جائے۔ عنایت ہوگی۔

نور الحسن راشد کاندھلوی

مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، مولویان۔ کاندھلہ، ضلع شاملی (یوپی) ۲۴۷۷۷۵
nhrashidkandhlavi@yahoo.com

دارالمصنفین کے لیل ونہار

۱۵ اگست کے موقع پر دارالمصنّفین میں پرچم کشائی

ہندوستان کی تحریک آزادی میں دارالمصنفین نے شروع سے اہم رول ادا کیا ہے۔اس زمانہ میں یہ ادارہ مجاہدین آزادی کا خاص مرکز رہا۔ آزادی وطن کے وقت سے ہی یہاں ۱۵ اگست اور ۲۶ جنوری کو ترنگا لہرانے کی رسم چلی آئی ہے۔ حسب روایت آزادی کے پچہترویں برس یعنی ۱۵ اگست کی صبح کتب خانہ کے سامنے لان میں مولانا عمیر الصدیق دریابادی نے ترنگا لہرایا۔اس کے بعد قومی ترانہ اور علامہ اقبال کی نظم پڑھی گئی۔ جنگ آزادی کی تاریخ،اہل وطن کے درمیان اس کی اہمیت اور اس کے پیغام بالخصوص ارباب دارالمصنفین نے وطن کی آزادی میں کس قسم کی قربانیاں پیش کی ہیں،اس کی مناسبت سے مختصر اور جامع خطاب بھی کیا اور آخر میں ملک میں امن و امان کی دعا کی۔اس موقع پر دارالمصنفین کا عملہ موجود تھا۔پرچم کشائی کی اس تقریب کے اختتام کے بعد شیرینی بھی تقسیم کی گئی۔

دو اہم مہمانوں کی آمد

ماہ جولائی میں دارالمصنفین میں دو اہم ہند نژاد امریکی مسلمان دانشوروں کی آمد ہوئی۔ ۲۰ جولائی ۲۰۲۲ کو دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے نئے ممبر طارق اعظم صاحب کے ہمراہ امریکہ کے حسن غیاث صاحب آئے اور ۲۱ جولائی کو سہیل فاروقی صاحب آئے۔ حسن غیاث صاحب سعودی عرب میں بن زقر (یونیلیور) کمپنی کے عرصے تک ڈائرکٹر رہے ہیں اور اب ہارورڈ یونیورسٹی میں ایڈوانسڈ لیڈرشپ فیلو ہیں، جبکہ سہیل فاروقی صاحب K12Insight نامی کمپنی کے چیف اگزیکیٹو آفیسر ہیں جو تعلیمی سافٹ ویئر بناتی ہے۔ دونوں نے دارالمصنفین کے ذمے داران اور رفقاء سے کافی دیر تبادلۂ خیال کیا، لائبریری اور دوسری سہولتوں کا جائزہ لیا اور مستقبل کے پروگرام کے بارے میں اپنی آراء کا اظہار کیا تاکہ دارالمصنفین حالات حاضرہ کے تئیں اپنی ذمہ داری پوری کرسکے۔

(ادارہ)

رسید کتب موصولہ

استیعاب (کلیات دوم): ڈاکٹر راہی فدائی، ہمالیہ بک ورلڈ، معظم جاہی مارکٹ روڈ، حیدرآباد، صفحات ۳۵۶ سال اشاعت ۲۰۱۵ء، قیمت ۵۰۰ روپے۔

انور اعظمی، ایک بازیافت: حکیم نازش احتشام اعظمی، البلاغ پبلی کیشنز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات ۲۱۴۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۳۰۰ روپے۔

پیکر فکر و عمل، مولانا ابوالکلام آزادؒ: ڈاکٹر محمد اختر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، صفحات ۲۶۵ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۳۰۰ روپے۔

تذکرہ استاذ القراء قاری عبدالمنان الاعظمی: جناب اسعد ندیم انصاری، مئوناتھ بھنجن، یو.پی، صفحات ۱۶۰، سال اشاعت ۲۰۲۱ء قیمت درج نہیں۔

تذکرہ معاصر شخصیات: حکیم ظل الرحمن، ابن سینا اکاڈمی، علی گڑھ۔ صفحات ۴۰۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۶۰۰ روپے۔

ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت: ڈاکٹر ندیم احمد، کتابی دنیا، گلی نواب مرزا، محلہ قبرستان، ترکمان گیٹ، دہلی۔ صفحات ۶۰۰۔ سال اشاعت ۲۰۱۸ء، قیمت ۷۹۵ روپے۔

سوانح خواجگان چشت: شاہ اشتیاق ایوبی، خانقاہ چشتیہ اصدقیہ فریدیہ، ذاکر نگر، دہلی، صفحات ۵۴۴۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۶۰۰ روپے۔

صیقل آشنا (مجموعہ کلام): ڈاکٹر راہی فدائی، الانصار پبلی کیشنز، ریاست نگر، حیدرآباد۔ صفحات ۱۲۸، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: ۳۵۰ روپے۔

منظر اعظمی، فن اور شخصیت: حکیم نازش احتشام اعظمی، البلاغ پبلی کیشنز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر دہلی۔ صفحات ۲۶۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۴۰۰ روپے۔

ہندوستانی مسلمان، لائحہ عمل: جناب کے۔ رحمٰن خاں، فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ، نئی دہلی۔ صفحات ۱۶۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت: ۲۵۰ روپے۔

مضمون نگاروں کے لئے اعلان

۱۔ مضمون صرف ورڈ MS Word پر و گرام میں، جمیل نوری نستعلیق فانٹ، پوائنٹ ۱۵ میں بذریعہ ایمیل بھیجیں۔ایمیل کا پتہ: info@shibliacademy.org

۲۔ اگر مضمون مخطوطہ حالت میں دستی یاڈاک سے بھیجا جارہا ہے تو براہ کرم کاغذ کے صرف ایک طرف اچھا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں اور مضمون کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ ہر صفحے کے حوالہ جات اسی صفحے پر نیچے حاشیے پر نمبر وار لکھیں۔

۴۔ آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

۵۔ حوالے اس ترتیب سے ہوں: مصنف، کتاب کا نام، ناشر، جگہ، سال، جلد (اگر ایک سے زیادہ جلد ہو)، ایڈیشن (اگر طبع اول کے بعد کا ایڈیشن ہو)، صفحہ، صفحات۔

۶۔ مضمون A4 سائز کے ۶۔ ۲۰ صفحات کے درمیان ہو اور ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہو۔

۷۔ معارف میں حتی الامکان سلسلہ وار مضامین نہیں شائع کئے جائیں گے۔

۸۔ معارف میں صرف غیر مطبوعہ مضامین و مقالات کو جگہ دی جائے گی۔ کہیں اور چھپنے کے لئے بھیجا گیا مضمون قابل قبول نہیں ہو گا۔

۹۔ نئے مضمون نگار اپنے مضامین کو معارف بھیجنے سے پہلے اپنے اساتذہ یا معتبر اہل علم کو دکھالیں۔

۱۰۔ نئے مضمون نگار اپنے مضمون کے ساتھ اپنی مختصر کوائف نیز پورا پتہ بشمول موبائل اور ایمیل پتہ بھی بھیجیں۔

۱۱۔ ہر مقالے کے ساتھ یہ وضاحت ہو کہ یہ مقالہ پہلے کہیں نہیں چھپا ہے اور اسے چھپنے کے لئے کہیں اور نہیں بھیجا جارہا ہے۔

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات فارسی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	300/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم (اول)	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم (دوم)	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم (سوم)	125/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم (چہارم)	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم (پنجم)	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-	الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-	اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-	الکلام	250/-
		علم الکلام	200/-
خطبات شبلی	150/-	انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print SEP 2022 Vol. 209/9

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنفین کی چند اہم مطبوعات

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندویؒ	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعات شبلی	״״	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندویؒ	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	600/-
تذکرۃ المحدثین (اول)	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	200/-
تذکرۃ المحدثین (دوم)	״״	225/-
تذکرۃ المحدثین (سوم)	״״	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمنؒ	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلیؒ	330/-
تاریخ اسلام (اول و دوم مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	375/-
تاریخ اسلام (سوم و چہارم مجلد)	״״	500/-
تاریخ صقلیہ اول	سید ریاست علی ندویؒ	400/-
تاریخ صقلیہ دوم	״״	400/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	375/-